إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جولائی ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۳ء/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○فکر و نظر

وقت کے دھارے کے خلاف چلنا		۴

○شذرات

دہشت گردی کے خاتمے کا حل تو واضح ہے مگر	مدیر	۶
مصر کی صورت حال		۷

○تعلیم و تربیت

ہم کتنے ظالم ہیں	اوریا مقبول جان	۸
علوم کی اسلامی تشکیلِ نو۔ چند اہم مباحث	ڈاکٹر محمد امین	۱۲
ہماری منزل تخلیقِ علم ہونی چاہیے محض حصول علم نہیں	افتخار الدین منصور	۲۴

○دینی مدارس کا نصاب تعلیم

البرہان کے مولانا مدنیؒ نمبر پر تبصرہ	مولانا مفتی عبدالواحد	۲۸

○میڈیا

پاکستانی میڈیا۔ بکاؤ مال اور مخالف اسلام و پاکستان	مدیر	۳۲

○انتخابات 2013ء

دینی سیاسی جماعتیں شکست کی خود ذمہ دار ہیں	پروفیسر ملک محمد حسین	۳۳
جماعت اسلامی۔ ناکامی کا تیر بہدف نسخہ	پروفیسر طارق بٹ	۳۷

○اسلام اور مغرب

فکر مغرب	مولانا وحید الدین	۳۹
اسلام اور کنزیومرازم	عبدالقادر سیف	۴۸

○تزکیۂ نفس

روزۂ بے ثمر	مدیر	۵۱

○دینی مسالک میں تقارب

ملی مجلس شرعی کا ۱۸ نکاتی متفقہ اعلامیہ	ملی مجلس شرعی	۵۳

○تبصرۂ کتب

درس نظامی کی اصلاح و ترقی از مولانا محمد بشیر سیالکوٹی	مدیر	۵۶

فکر و نظر

نظام تعلیم و تربیت

وقت کے دھارے کے خلاف چلنا

یہ غالباً 1987ء کی بات ہے، مدیر تکبیر محمد صلاح الدین صاحب (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) جن سے ریاض سعودی عرب میں رہتے ہوئے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتے، مجھے فون کرتے تو اور پھر ہم مل کر ان کے دوست احباب سے ملنے جاتے۔ اسی دوران جب انہیں اصلاح تعلیم کے حوالے سے ہمارے پروگرام اور ارادوں کا پتہ چلا تو انہوں نے کراچی کے فاران کلب میں ہمارے لئے ایک نشست کا اہتمام کیا اور شہر کے پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے عناصر کو وہاں مدعو کیا۔ ہم نے اپنی سوچ اور پروگرام حاضرین کے سامنے رکھا کہ تعلیم کی اسلامی تشکیل نو مسلم فرد، معاشرے اور ریاست کے قیام واستحکام کے لئے ناگزیر ہے اور یہ کہ نظریۂ حیات کے مطابق انسان سازی کے بغیر کوئی بھی تہذیب اپنے پیروں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ ہماری گفتگو کے آخر میں دو صاحبان تشریف لائے اور پچھلی نشستوں پر جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے (بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ان میں سے ایک کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر منظور الدین احمد تھے اور دوسرے فخر الدین جی ابراہیم (سابق گورنر سندھ، جج سپریم کورٹ وحال چیف الیکشن کمشنر پاکستان)۔ جب سوال وجواب کی نشست شروع ہوئی تو ڈاکٹر منظور صاحب نے ہم سے پوچھا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اور آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ شاید غلط نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ جو کچھ بیچنا چاہتے ہیں کیا مارکیٹ میں اس کا کوئی خریدار بھی ہے؟ ہم نے ایک لحظہ سوچا اور پھر کہا ''ہم جو کہہ رہے ہیں وہ ہمارے نزدیک اسلام کا عین تقاضا اور ملت کی سخت ضرورت ہے لہٰذا ہم جو کہنا اور کرنا چاہتے ہیں وہ کہنے اور کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے، اس بات سے قطع نظر کہ اس کے خریدار کتنے ہیں؟''

اور یہ پچھلے سال کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ انہوں نے دوستوں کی ایک محفل میں مولانا زاہد الراشدی صاحب سے پوچھا کہ یہ ڈاکٹر امین صاحب جو اتنے عرصے سے شدومد سے تعلیمی ثنویت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور وحدت تعلیم کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس پر اس کا کچھ اثر پڑا ہے؟ مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن سن کر مدارس والے اپنے پروگرام پر مزید پختہ ہو گئے ہیں۔''

ہم کہتے ہیں کہ وقت کے دھارے کے خلاف چلنے اور تیرنے سے واقعی فاصلہ کاٹنا مشکل ہوتا ہے۔ تند وتیز لہروں سے لڑلڑ کر ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں اور فاصلہ طے نہیں ہوتا۔ بین الاقوامی ماحول

خلاف، حکومتیں اور بیوروکریسی مخالف، دینی مدارس اپنے روایتی چلن پہ مصر، عام لوگ تو رہے ایک طرف خود دینی جماعتوں کے افراد نے جدید تعلیم کو کاروبار سمجھ کر مغربیت کو سینے سے لگا لیا ہے، اُدھر ہماری صلاحیتیں محدود اور ہر قسم کے تجرب سے ہم محروم —— تو فاصلہ طے ہو تو کیسے ہو؟

تاہم، ہم جیسوں کے کام میں لگے رہنے کے لیے پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وہ الفاظ کافی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان الاسلام بدأ غریبا و سیعود غریبا کما بدأ فطوبی للغرباء" (صحیح مسلم وسنن ترمذی)

یعنی اسلام جب آیا تو اجنبی اور نامانوس لگتا تھا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر لوگوں کے لئے نامانوس اور اجنبی ہو جائے گا لیکن خوشخبری ہے ان کے لئے جو اس کی طرف دعوت دیں اور اس پر عمل کریں اور معاشرے میں اجنبی اور نامانوس بننے پر راضی ہو جائیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِ اعانت سالانہ 400 روپے　　　تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ و طالبات کے لیے　　250 روپے سالانہ

نام............................ پتہ..

.... فون.............................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ B-369، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں

شذرات مدیر

پاکستان میں دہشت گردی

حل تو واضح ہے مگر............

سابقہ حکومت اور موجودہ حکومت کے بعض ذمہ داران علی الاعلان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بلوچستان، کراچی اور پاکستان میں دوسری جگہوں پر جو دہشت گردی ہو رہی ہے اس کے پیچھے غیر ملکی قوتیں ہیں اور میڈیا کے بعض تجزیہ کار کھلم کھلا امریکہ، بھارت، اسرائیل، افغانستان، روس (اور بعض دبئی بمقابلہ گوادر) کا نام لیتے ہیں۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر لڑنے والے پاکستانی طالبان (اور لشکر جھنگوی، لشکر مہدی وغیرہ) ہیں لیکن مذکورہ غیر ملکی قوتوں کے گروپ بھی ان مذہبی گروہوں کے نام سے کاروائیاں کرتے ہیں یا ان میں گھسے ہوئے ہیں۔ گویا دہشت گردی کے اسباب واضح ہیں: ۱۔ غیر ملکی پاکستان دشمن عناصر ۲۔ مذہبی گروپ خصوصاً طالبان پاکستان (اور ان کے نام پر یا ان میں گھسے ہوئے غیر ملکی ہاتھ اور جرائم پیشہ لوگ)۔

پاکستان کے سیاسی وعسکری مقتدر حلقوں میں اگر عقل اور جرأت ہے تو وہ غیر ملکی ہاتھ اور جرائم پیشہ عناصر کو قوت سے کچل دیں اور طالبان میں سے جو لوگ مخلص اور نفاذ شریعت کے خواہاں ہیں ان سے بات چیت کریں۔ ان کے جائز مطالبات مان لیں اور ان کے علاقے کو صوبہ بنا کر نیم خودمختاری یا خصوصی حیثیت دے دیں تاکہ وہ وہاں شریعت نافذ کر لیں۔ اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً ملائشیا کے ایک صوبے میں جہاں اسلام پسند لوگ کثرت سے ہیں وہاں اسلامی حکومت قائم ہے جبکہ مرکز میں دوسری سیاسی جماعت حکمران ہے اور اس کا مزاج مسلم لیگی ہے۔ بلکہ اس وقت بھی آزاد کشمیر اور بلوچستان میں شرعی عدالتیں بعض صورتوں میں عملاً کام کر رہی ہیں اور اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

ہماری رائے میں مندرجہ بالا لائحہ عمل ضروری ہے تاکہ پاکستان بھی سلامت رہے اور دہشت گردی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے ......لیکن لگتا ہے کہ خوش قسمتی ہم سے ابھی کوسوں دور ہے کیونکہ انتخابات کے بعد بننے والی نئی مسلم لیگی حکومت بھی امریکہ و بھارت کے چرنوں میں بیٹھی ہے اور مزید قربت کی خواہاں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر اس دہشت گردی کو ختم نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ ہمارے نزدیک پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت جو نہ امریکہ کی چھیڑی ہوئی جنگ سے نکلنے کی ہمت کر پا رہی ہے اور نہ پاکستانی طالبان سے مذاکرات کرنے کے لئے تیار ہے حالانکہ امریکہ خود افغان طالبان سے مذاکرات کر رہا ہے لیکن ہمارے غلام حکمرانوں کو اس کی بھی ہمت نہیں ہو رہی۔

شذرات مدیر

مصر کی صورتحال

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے مصائب کے خود ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم میں ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں اور وہ مؤثر بھی ہیں، جو بے دین ہیں، اپنے نفس کے بندے ہیں، حبّ جاہ و مال کی خاطر ملت فروشی اور وطن فروشی کے لئے تیار رہتے ہیں اور جب بھی کوئی ان کے اچھے دام لگا دے وہ دم ہلاتے ہوئے لپکتے ہیں اور مال لگانے والے بھی موجود ہیں۔ ہم پاکستان میں یہ ہوتا عرصے سے دیکھ رہے ہیں اور آج کل مصر کی باری ہے۔

اگر مصر میں منتخب حکومت کا تختہ الٹنے والا سیکولر فوج کا کمانڈر انچیف السیسی [جس کی بغاوت کو اوباما نے ’انقلاب‘ سے تعبیر کیا ہے] اور مصر کا عبوری صدر بننے والا آئینی عدالت کا چیف جسٹس عدلی منصور اگر یہودی اور سیکولر نہ بھی ہوتا اور نائب صدر بننے والا البرادی اگر یہودی فرانسیسی ماں کا بیٹا نہ بھی ہوتا اور ساری زندگی مغرب کی ایجنٹی کا کام نہ کرتا رہا ہوتا تو بھی مرسی کا یہ گناہ نا قابل معافی تھا کہ وہ نفاذ اسلام کی بات کرتا تھا، مغرب کی ڈکٹیشن کو رد کرتے ہوئے علاقے کے مسلم ممالک کو متحد کر رہا تھا، اسرائیل کی من مانی میں رکاوٹ تھا، غزہ کے فلسطینیوں کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے ملک کے فائدے کے لئے اپنی مرضی سے پالیسیاں وضع کرتا تھا۔

مصر میں جو کچھ ہوا وہ بلاشبہ امریکہ اور اسرائیل کی پلاننگ اور سازش سے ہوا۔ ہم اس کے لئے امریکہ اور اسرائیل کی مذمت کرتے ہیں لیکن اس سے زیادہ مذمت ہم مصر کے ان مسلمان سیاسی لیڈروں، عدلیہ کے ججوں اور فوجی جنرلوں کی کرتے ہیں جو ان سازشیوں کے آلہ کار بنے اور جنھوں نے متاع قلیل کے لئے ملت اور وطن فروشی کی راہ اپنائی۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

اس میں مصر کی اسلامی قوتوں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ اس وقت بھی متحد نہ ہوئیں جب کفر اُن کے خلاف متحد ہو چکا تھا اور خود الاخوان المسلمون (اور دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں) کے لیے بھی اس میں سبق ہے کہ مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی تبدیلی کے لیے ذریعے کے طور پر قبول کرنے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مصر نے تو ابھی اس راہ میں قدم رکھا ہی ہے جب کہ ہم اس کا مزہ ٦٦ سال سے چکھ رہے ہیں، **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

تعلیم و تربیت　　اوریا مقبول جان

ہم کتنے ظالم ہیں

کیا کبھی کوئی سوچ سکتا ہے کہ ماں باپ جو اولاد کے لئے اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہوتے ہیں خود بھوکے رہ کر انہیں کھلاتے ہیں اپنی تمام خواہشات کو پس پشت ڈال کر ان کے لئے آسائش اور آرام مہیا کرتے ہیں۔ گھر کی ہر قیمتی چیز ان کی تعلیم، صحت، شادی اور دیگر ضروریات کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ وہی والدین اپنا کل اثاثہ قربان کر کے ان کے لئے مہنگی ترین دکان سے خوشنما اور دیدہ زیب پیکٹوں میں خوبصورت ترغیبات اور بہترین میٹھے ذائقے والا زہر خریدیں اور پھر جیسے ہی ذرا بولنے اور سوچنے کے قابل ہو، اسے کھلانا شروع کر دیں اور اس کے برسرِ روزگار ہونے تک اسے کھلاتے رہیں۔ آپ بالکل یقین نہیں کریں گے۔ لیکن طویل عرصے سے ہم یہ میٹھا زہر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کر کے اپنے بچوں کو کھلا رہے ہیں اور اس پر خوش اور شاداں بھی ہیں۔ اس زہر پر پلی ہوئی پہلی نسل اب جوان ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور وہ اسی زہر میں بجھے ہوئے تیروں جیسے سوال ہم سے کرتی ہے۔ ہماری زندگی، اخلاقی ماحول، مذہب، دین اور ہمارے تصورات کو دقیانوسی، فرسودہ اور عقل سے بے بہرہ قرار دیتی ہے اور ہمیں چودہ سو سال پرانے خوابوں میں زندہ رہنے والا بے وقوف سمجھتی ہے۔

ہم نے اپنی اس نسل کی تباہی پر خود دستخط کیے اور اب مزید اس پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ دنیا کی پانچ ہزار سالہ تحریر شدہ تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا اور ترقی کی ہو۔ ہمیں گزشتہ 25 سال سے ایک سبق طوطے کی طرح پڑھایا گیا کہ انگریزی کے بغیر اب ترقی کرنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ سوال کسی نے چھوٹے چھوٹے ملکوں، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، آسٹریلیا، ہالینڈ اور بڑے بڑے ملکوں، چین، جاپان اور جرمنی سے نہیں پوچھا جو اپنی زبانوں میں پی ایچ ڈی تک کرواتے ہیں۔ سنگاپور نے انگریزی میں تعلیم کا تجربہ کیا اور بیس سال بعد وہ اب سر پیٹ رہے ہیں کہ ان کے ہاں تخلیقی تحقیق بالکل نہیں ہو رہی اور وہ بالکل نقال بندر بن کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے کہ آپ علم کسی دوسرے کی زبان میں میں حاصل کر سکتے ہیں لیکن تخلیق کے دروازے اپنی ہی زبان سے کھلتے ہیں۔ لیکن یہاں المیہ یہ نہیں کہ ہم نے انگریزی زبان میں بچوں کو تعلیم کیوں دلوائی۔ سائنس کا مضمون تو ہماری مجبوری تھی کہ ہمارے ملک کے پانچ لاکھ اساتذہ نے اپنی زبان میں ایک لاکھ کتب بھی ساٹھ سالوں میں ترجمہ نہ کیں۔ المیہ تو وہاں سے شروع ہوا جب ہم نے اپنی تباہی کے دوہرے پروانے پر دستخط کیے۔ ایک تو سائنسی تعلیم انگریزی میں دلوائی جس سے تخلیقی تحقیق کا دروازہ ہم پر بند ہو گیا اور دوسرا پورے کا پورا نصابِ تعلیم ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جو بچہ سکول میں داخل ہوتے ہی اللہ اس کے رسول کی تعلیمات

اور اپنے ماضی کے ہیروز کی کہانیاں پڑھ کر جوان ہوتا تھا، جس کی زندگی کے ہر قدم پر اخلاقیات کا درس اسے اپنے مشاہیر کی پاکیزہ زندگی سے ملتا تھا، جو والدین کے احترام سے لے کر زندگی کی شرم وحیاء اور مہر ومحبت کے اصول پڑھتا اور ان کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتا تھا اب اس کے ہاتھ میں ان ہزاروں انگلش میڈیم سکولوں نے جو کتابیں تھما دی ہیں ان میں وہ تمام کہانیاں ہیں، وہ تمام قصے ہیں، وہ تمام اخلاقی اصول ہیں جن کے پڑھنے کے بعد انہیں اپنے ماحول' اس کی اقدار و روایات اور طرز زندگی سے بوآنے لگتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی اور دنیا کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ مَیں سکول کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کی نہیں صرف کورس کی کتابوں کی بات کر رہا ہوں۔ ورنہ لائبریریاں تو ایسے زہر سے پٹی پڑی ہیں۔ یہ چند ایک کتب ہیں جو ہمارے بچے پڑھتے ہیں اور ہم فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے A اور O لیول میں کامیابی کے جھنڈے لہرا دیئے۔

1- A Christmas Carol: پوری کتاب کرسمس کے تہوار اور عقائد پر گھومتی ہے۔ جس بچے کو قرآن پڑھانے پر دہشت گردی کی تعلیم کہا جائے، وہاں اس کتاب کو صرف اس لئے پڑھایا جا رہا ہے کہ یہ بچے مغربی مذاہب سے خود کو علیحدہ محسوس نہ کریں اور غیر محسوس طریقے پر اس کا حصہ ہوں۔

2- The Golden Touch: یہ یونانی دیو مالائی خداؤں کی داستانیں ہیں جو لیول II میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جس بچے کو اللہ کی وحدانیت اور رسول کی سیرت پڑھنی چاہیے اسے وینس اور کیوپڈ جیسے دیوتاؤں کے معاشقے پڑھنے کو ملتے ہیں۔

3- King Solomon's Mines: یہ کہانی جنسی تعلقات اور جنسی ناہمواری کے انیسویں صدی کے تصورات پر لکھی گئی ہے اور جس مرد اور عورت کی تلاش کو اسی کے چھپے ہوئے ''جسمانی خزانوں'' کی جستجو بتایا گیا ہے اور خواتین کی جبلتوں اور مرد کی جسمانی ہیئت کی مثالیں بیہودہ انداز میں دی گئی ہیں۔ یہ کتاب لیول IV میں پڑھائی جاتی ہے۔

4 - The Emperor's New Clothes and other Stories: ان میں ایک لنگڑے سپاہی کی کہانی ہے جو ایک ناچنے والی گڑیا کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ جو کپڑوں کے بغیر شہر کا دورہ کرتا ہے اور اگر کوئی والد یا والدہ ''The Kiss'' پڑھ لے تو حیرت میں ڈوب جائے۔

5 -Treasure Island: یہ لیول I کی کتاب ہے۔ کہانی بحری قزاقوں پر ہے جو اپنے قوانین رکھتے ہیں۔ شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں اور اس شراب کی تلاش میں پاگل جہاز کا کپتان۔

6- The Adventures of Sherlock Holmes: جاسوسی کہانیاں لیکن عشق ومحبت کے رسیلے جذبات سے لتھڑی ہوئیں۔ جو لوگ نسیم حجازی کی رزمیہ عشقیہ کہانیوں پر اعتراض کرتے تھے وہ یہ سب کچھ پڑھاتے ہیں۔

7 - Around The World in Eighty Days: یہ لیول III کی کتاب ہے جس کا ایک کردار شرط لگاتا ہے اور دنیا گھومتا ہے۔ بچوں کے ذہن میں اس کے دلچسپ افسانے تو آتے ہیں لیکن اس کا ہیرو شراب بھی پیتا ہے اور جگہ جگہ محبت بھی کرتا ہے۔

8- Just 50 Stories: دنیا بھر میں نسلی تعصب اور گورے کی نسل برتری کے قائل رڈیارڈ کپلنگ کی یہ کہانیوں کی کتاب جس میں اللہ کو ایک عظیم جادوگر کہا گیا ہے جس نے پہلے زمین بنائی پھر سمندر۔ یہ لیول I میں پڑھائی جاتی ہے۔

9 - Tales of King Arthur یہ بادشاہ کی بیوی ملکہ Guenevere کے La Uncelot کے ساتھ ایک خفیہ عشق کی داستان ہے۔

اس کے علاوہ چند کہانیوں کی کتابیں یہ ہیں:

10- The Brave Little Tailor

11- Heros and Heroins

12- The Canterville Ghost

13- The Gifts and other stories

14- The Golden Goose and other stories

15- Great Expectations

16- A Mid Summer Night's Dream and other stories

آپ ان ساری کی ساری کہانیوں کو اٹھالیں آپ کو ان میں ایک ایسا ماحول ملے گا، ایسی اخلاقیات ملیں گی، ایسا طرز زندگی نظر آئے گی جس کا نہ ہماری زمین سے کوئی تعلق ہے نہ ہمارے آباواجداد سے۔ نہ ہمارے مذہب سے کوئی رشتہ ہے اور نہ تصور دین سے۔ یہ فزکس کیمسٹری، بیالوجی، میتھس نہیں کہ ہم کہیں کہ ان کے بغیر ہماری ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ اخلاقیات ہیں جو ان کہانیوں کی صورت میں ہماری نسلیں پڑھ رہی ہیں۔ انہی کے کرداروں کے روپ میں خواب دیکھتی ہیں۔ انہیں اپنی زندگیوں کا آئیڈیل بناتی ہیں۔ اس طرح کے ماحول اور ویسے طرز زندگی کو اپنے لیے رہنما تصور کرتی ہیں۔ ظلم یہ نہیں کہ ہماری نسلیں یہ کہانیاں پڑھ رہی ہیں۔ ظلم یہ ہے کہ وہ جس عمر میں پڑھ رہی ہیں اس عمر میں انسان اپنی زندگی کے ہیروز کے تصورات ذہن میں پختہ کرتا ہے۔ اس پر سب سے بڑا ظلم یہ کہ ہم اس سب کو اپنے بچوں کے بہترین مستقبل کے لے اپنی جمع پونجی قربان کرکے تحفے میں دے رہے ہیں اور عظیم ترین ظلم یہ کہ ہم نے ان کہانیوں کے مقابل اپنے بچوں کے لئے کوئی اخلاقی، مذہبی اور دینی کہانیاں، جو سچ پر مبنی ہوں، تخلیق ہی نہیں کیں۔ ہم کتنے ظالم ہیں۔

نوٹ: العلم ٹرسٹ اسلام کی تاریخ ، اس کے مشاہیر اور اس کے طرز زندگی پر مبنی کہانیوں کی Animations کا آغاز کر چکا ہے جو لوگ اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں ہم سے Contact@alilmtrust.com.pk پر رابطہ کریں (بشکریہ ’’ایکسپریس‘‘)۔

البرہان: اوریا صاحب کی بات بالکل بجا ہے اور ہمارے دل کی آواز ہے۔ ان کا العلم ٹرسٹ اس ضمن میں جو بھی کام کرے وہ قابل تحسین ہے۔ فساد کے علم بردار عناصر جتنی قوت سے کام کر رہے ہیں ان کے اثرات بد کے ازالے کے لیے اہل ایمان جتنا بھی کام کریں وہ تھوڑا ہے۔ یہ کہنے کے بعد عرض ہے کہ اب ایسا بھی اندھیر نہیں کہ اس ضمن میں کوئی کام نہ ہوا ہو۔ کام ہوا ہے اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی اور موجود ہے لیکن دقت یہ ہے کہ وہ گوشۂ خمول میں پڑا ہوا ہے، وہ کسی کے زیر استعمال نہیں ہے، وہ معروف و مشہور نہیں ہے، وہ سکہ رائج الوقت نہیں ہے، وہ سکولوں، کالجوں میں پڑھایا نہیں جاتا، نصاب کا حصہ نہیں ہے اور بگاڑ کی عالمی قوتوں نے ہمارے نصاب میں وہ چیزیں شامل کر دی ہیں جن کا اوریا صاحب نے ذکر کیا ہے۔ وہ ان کی تہذیب اور فکر کی عکاس ہیں اور اسلامی اصول واقدار کی نفی کرتی ہیں۔

تعلیم کے اس بگاڑ کے دو بڑے سبب اور مظہر ہیں: ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو ان کی فکری و تہذیبی بنیاد سے محروم کرنے کی علمبردار ان بین الاقوامی قوتوں نے تعلیم کو صوبائی مسئلہ بنا دیا ہے کہ پاکستانی قوم میں فکری یک جہتی نہ رہے اور صوبوں کے کج رو اور کم فہم عناصر کے ذریعے ان کا مقصد بخوبی حاصل ہو جائے۔ دوسرے انہوں نے اپنے تعلیمی مشیروں اور ’’فروغ تعلیم کے لیے‘‘ امداد دینے والی ایجنسیوں کے ذریعے پنجاب کے کم فہم لیگی حکمرانوں کو مسحور کر کے انہیں اپنی لائن پہ لگا لیا ہے جنہوں نے صوبہ پنجاب میں انگلش میڈیم لازمی کر دیا ہے اور اردو میڈیم کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان حکمرانوں کی علم وعقل سے محرومی کی یہ حالت ہے کہ وہ نظام تعلیم کو اسلام اور نظریۂ پاکستان کی فطری بنیادوں سے محروم کر کے اور لیپ ٹاپ وسولر لیمپ تقسیم کر کے اور امتحانات میں اول آنے والوں کو خطیر انعام دے کر اور بین الاقوامی دورے کروا کر (اور اب لڑکیوں کو سکوٹر مہیا کرنے کے منصوبے بنا کر) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پنجاب میں تعلیمی انقلاب لا رہے ہیں۔ یہ پبلک سیکٹر کا حال ہے اور پرائیویٹ سیکٹر بھی بڑے خشوع وخضوع سے اسی راستے پر چل رہا ہے اور اسے چلانے والی بگاڑ کی علمبردار یہی بین الاقوامی اور مقامی قوتیں ہیں اور ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں کہ اسلامی عناصر یا تو سوئے ہوئے ہیں اور جو جاگ رہے ہیں وہ بھی اسی حسینۂ عالم یعنی مغربی تہذیب کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ ان حالات میں تعلیم میں اسلامی اہداف ومقاصد کی بات کرنا اور مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے اصول واقدار کو رد کرنے کی بات کرنا کتنا مؤثر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اوریا مقبول جان جیسے اصحاب درد اور البرہان جیسے جرائد موجود ہیں جو اپنی بات کہہ رہے ہیں اور وہ کچھ لوگوں تک پہنچ رہی ہی۔ رہے نام اللہ کا۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

چند اہم مباحث

علوم کی اسلامی تشکیلِ نو ناگزیر ہے

علوم کی تشکیل نو بلاشبہ اہم کام ہے جو کسی بھی قوم اور تہذیب کو زندہ، متحرک اور غالب رکھنے کے لئے ناگزیر ہے لیکن علم چونکہ پڑھانے پڑھنے سے ہی زندہ رہتا ہے اور اسی سے اس میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا جب تک تعلیم کی اسلامی تشکیل نو نہ کی جائے علوم کی اسلامی تشکیل نو محض ایک نظری (Theoretical) کام ہو کر رہ جائے گا اور پھل پھول نہیں سکے گا اور نہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ علم کی تشکیل نو کا کام تعلیمی اداروں کے نصابات کی شکل اختیار کرے اور اگرچہ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ادارے یونیورسٹیاں ہی ہوتی ہیں اور وہیں یہ کام بڑے پیمانے پر ہو سکتا ہے لیکن سکولوں کالجوں کی تعلیم اور نصابات کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوتی کیونکہ جب تک نچلی سطح کے تعلیمی اداروں میں نصابات کی اسلامی تشکیل نو نہیں ہوگی صرف اوپر کی سطح پر یہ کام اتنا موثر اور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ تعلیم کا آخری مقصود و منتہیٰ اس دنیا میں یہ ہے کہ آدمی بدل جائے یعنی مسلم شخصیت کی تعمیر اس طرح ہو کہ الٰہی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنا اس کے لئے آسان و سہل ہو جائے۔ یہ چیز، جسے شرعی اور قرآنی اصطلاح میں تزکیۂ نفس اور تعلیمی اصطلاح میں تربیت، تعمیر شخصیت یا کردار سازی کہتے ہیں، پورے تعلیمی ڈھانچے کی اسلامی تشکیل نو چاہتی ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نصابات کی اسلامی تشکیل نو اس کا جزو اعظم ہے۔

خلاصہ یہ کہ علوم کی اسلامی تشکیل نو کا کام جب تک سکول سے لے کر یونیورسٹی تک کے نصابات (اور ہم نصابی سرگرمیوں) کی اسلامی تشکیل نو کی صورت میں نہ ڈھلے، یہ کام نتیجہ خیز اور مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا جیسا کہ بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی واشنگٹن (International Institute of Islamic Thought) کے علوم کی اسلامی تشکیل نو کے تجربے کے غیر مؤثر نتائج سے ظاہر ہے۔

مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا رد

اگر مغرب کی ذہنی غلامی نے ہمارے آزادانہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماؤف نہ کر رکھی ہوں تو اس امر کا ادراک کرنے میں زیادہ مشکل نہیں پیش آتی کہ ہم مسلمانوں کے لئے آج کے عہد کا سب سے بڑا

چیلنج اور فتنہ مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ ہے۔ایسا متعدد وجوہ سے ہے:

1۔ مغربی تہذیب کے احیاء کی تحریک مسلمانوں کے غلبے کے خلاف انتقامی اور حریفانہ انداز میں شروع ہوئی اور اس کے یہ تیور اس کی سرشت میں شروع سے لے کر آج تک موجود ہیں۔

2۔ اس کے نتیجے میں اس نے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لئے (جن کی کمزوری کی اصل وجہ اپنے نظریۂ حیات سے ان کا انحراف اور عدم وابستگی تھی) نہ صرف سازشیں کیں اور انہیں قوت قاہرہ سے کچلا بلکہ ان کو ذہنی غلام بنانے کے لئے ان کے نظام تعلیم و تربیت کو ختم کر کے اور اپنی فکر و نظر کے مطابق اس کی تعمیر نو کر کے اور ذہن سازی کے دوسرے سارے میسر ذرائع استعمال کر کے انہیں مغربی فکر و تہذیب کا خوگر اور رسیا بنا دیا۔

3۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل مغرب کو مسلمانوں کو مجبوراً کچھ آزادی دینا پڑی لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی امن کا بھیس بدل کر مسلم دنیا کو معاشی شکنجے میں جکڑ کر اور ان کے تعلیم، میڈیا، کلچر اور سیاسی اداروں میں نقب لگا کر مغربی تہذیب کے غلبے کی شمع روشن کیے ہوئے ہے اور کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتا کہ مسلم معاشرے اسلام سے تمسک کی راہ پر چل پڑیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اپنی پُرامن سازشوں میں ناکام ہو کر ننگی جارحیت پر اتر آتا ہے جیسا کہ عراق، افغانستان، فلسطین اور لیبیا میں ہو چکا ہے اور پاکستان، یمن، شام اور صومالیہ پر اس کی فوجی یلغار جاری ہے۔

4۔ مغربی فکر تہذیب جو اہل مغرب مسلمانوں پر طوعاً و کرہاً نافذ کرنے اور ان کے معاشرے میں جاری رکھنے میں کوشاں ہیں اپنی اصل میں الحادی اور دین دشمن ہے اور خصوصاً اسلام سے وہ اس لحاظ سے متضاد ہے کہ اسلام صرف روحانی امور سے بحث نہیں کرتا بلکہ معاشرے اور ریاست کو بھی اس کا مطیع دیکھنا چاہتا ہے لہٰذا مغربی تہذیب کا اسلام کو قبول نہ کرنا اور اسے ہر قیمت پر رد کرنا اس کے خمیر میں ہے۔

لہٰذا آج مسلم معاشرے میں علم اور تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کے کام کا بنیادی منہج ہی یہ ہونا چاہیے کہ پہلے مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کو رد کیا جائے اور پھر اسے اسلامی قالب میں ڈھالا جائے۔ مسلم دنیا میں جہاں بھی مغربی فکر و تہذیب سے مصالحت (Reconciliation) کر کے اور اسلامی و مغربی اصولوں کا ملغوبہ تیار کر کے کام چلانے کی کوشش کی گئی ہے اس کا نتیجہ مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کی صورت میں نکلا ہے نہ کہ اسلامی اصول و اقدار کی بحالی اور غلبے کی صورت میں، جس کی عملی صورتیں مسلم معاشرے میں ہر کہیں دیکھی جا سکتی ہیں مثلاً سیاست میں اسلامی جمہوریت کا تجربہ، تعلیم میں انگریزی زبان کا غلبہ، میڈیا میں انٹرنیٹ، ٹی وی اور موبائل کا استعمال، معیشت میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی معاونت

............وغیرہ۔

مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کو قبول کرنے کے لئے یہ دلیل دینا کہ جن اصولوں پر چل کر مغرب نے ترقی کی ہے وہ ہمارے اصول ہیں یا وہ ترقی کے بین الاقوامی سائنسی اصول ہیں اور اگر ہم بھی مغرب کی طرح ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ناگزیر ہے کہ ہم بھی انہی اصولوں کی پیروی کریں، انتہائی بودا اور احمقانہ استدلال ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر قوم اور تہذیب اپنے عقائد اور اپنے اصولوں سے وابستہ رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہے کیونکہ اس وابستگی کے نتیجے ہی میں اس کے اندر وہ صلاحتیں ابھرتی ہیں جو دنیا میں قطع اسباب اور ترقی کے لئے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت، نظم وضبط، ایثار و قربانی، اطاعت امیر، منصوبہ بندی، قانون کی پیروی............وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ اگر دو تہذیبوں کی فکری اساس میں اشتراک ہو تو وہ ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ بسہولت کر سکتی ہیں لیکن اگر ایک تہذیب کا ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور کائنات اور تصورِ اِلٰہ) دوسری تہذیب کے برعکس ہو تو ان کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا فطری طور پر محال اور منطقی طور پر ناممکن ہوتا ہے۔ اور یہاں یہی صورت اسلامی اور مغربی تہذیب میں ہے کہ دونوں کے ورلڈ ویو ایک دوسرے سے متضاد ہیں (مغربی تہذیب انسان کی خدائی، آخرت کے انکار اور معاشرے وریاست کے چلانے میں خدائی ہدایت کے ناقابل قبول ہونے پر استوار ہے جب کہ اسلام میں انسان کی حیثیت خدا کے عبد کی ہے، وہ آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور سارے شعبہ ہائے زندگی میں الٰہی ہدایت پر اصرار کرتا ہے لہٰذا اپنی اساسات میں ایک دوسرے سے متضاد ہونے کی بناء پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ نہیں کر سکتیں۔ اور اس اخذ واستفادہ کی ایک محدود اور محتاط صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی تہذیب کے علم بردار مغربی تہذیب کو اصولاً رد کرنے کے بعد ان عملی پہلوؤں کو، جن کی بنیاد انسانی تجربات ہیں، اس نقطہ نظر سے پرکھ سکتے ہیں کہ کیا وہ ان کے لئے قابل قبول اور مفید ہو سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں نہ ہو تو وہ ان کو اپنے دھارے میں لا کر اور اپنے رنگ میں رنگ کر ہی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

تشکیل نو کا پہلا ہدف اسلامی علوم ہونے چاہئیں

ممکن ہے ہماری اس بات سے بہت سے لوگوں کو تعجب اور اختلاف ہو کیونکہ مسلم دانشوروں کا ایک بڑا گروپ جدید عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو پر زور دیتا ہے (اس حوالے سے عالمی ادارہ فکر اسلامی واشنگٹن نے اپنے بانی ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کی سربراہی میں کافی کام کیا ہے) جبکہ دانشوروں کا

ایک دوسرا گروپ (جیسے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم اور ڈاکٹر مظفر اقبال وغیرہ) سائنس کی اسلامی تشکیل نو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ہماری اسلامی علوم کو زیادہ اہمیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بنیادی اہمیت تزکیۂ نفس یا تعمیر شخصیت کو حاصل ہے یعنی علوم اور تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا مقصد اور ہدف یہ ہے کہ ایسی مسلم شخصیت پروان چڑھے جس کے لئے اللہ و رسولؐ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا سہل و مرغوب ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول میں بنیادی کردار قرآن وسنت کی تعلیم ادا کرتی ہے نہ کہ عمرانی یا سائنسی علوم کی۔ اسی لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ اس معاملے میں دیگر علوم کی اسلامی تشکیل نو سے زیادہ اسلام کی تعلیم کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ قرآن وسنت کی نصوص ناقابل تغیر ہیں لیکن اگر ان کے نصاب کا انتخاب غیر موزوں اور طریق تدریس غیر مؤثر ہو اور اسی طرح ان کے معاون علوم کا نصاب اور منہج تدریس ناقص ہو تو ان کی تدریس سے مؤثر اور مطلوب نتائج نہیں نکل سکتے۔

ہمارے نزدیک مسلم امہ کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں اسلام کی تعلیم و تربیت غیر موثر ہو گئی جس کے نتیجے میں اسلامی اقدار کی نسل نو کو منتقلی کا نظام کمزور پڑ گیا اور صحیح و متوازن مسلم شخصیت پیدا ہونی بند ہو گئی۔ آج اگر ہم امت کے احیاء یا نشأۃ ثانیہ کے متمنی ہیں تو اس کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ہم ''اسلام کی تعلیم'' کے نظام کی تشکیل نو کریں اور اسے موثر بنائیں تا کہ یہ فرد کی تعمیر شخصیت و کردار کے حوالے سے نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم پاکستانی تناظر میں علوم اسلامیہ کی مروجہ تعلیم پر نظر ڈالیں تو مندرجہ ذیل امور ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں:

1۔ ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات یا اسلامک سٹڈیز کے زیر عنوان جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ انتہائی ناکافی اور غیر موثر ہے اور اس میں قرآن وسنت کی نصوص کی تعلیم بہت تھوڑی ہے یہاں تک کہ نہ قرآن پورا پڑھایا جاتا ہے اور نہ اس کا ترجمہ اور نہ اس کی زبان (عربی)۔ نصوص حدیث کی تدریس بھی برائے نام ہے۔

2۔ سکولوں میں اسلامیات اگرچہ لازمی ہے لیکن اسے انگریزی اور ریاضی جیسے اہم اور مرکزی مضامین کے مقابلے میں غیر اہم اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ٹائم ٹیبل میں اسے برائے نام وقت دیا جاتا ہے۔ اسے عموماً پہلا پیریڈ دیا جاتا ہے جب آدھی کلاس غیر حاضر ہوتی ہے یا آخری پریڈ دیا جاتا ہے جب آدھی کلاس پڑھے بغیر چھٹی کر جاتی ہے یا تھکی ہوئی ہوتی ہے۔

3۔ علوم اسلامیہ یا اسلامک سٹڈیز کالجوں، یونیورسٹیوں میں عمرانی علوم کی فیکلٹی کا ایک کمزور اور غیر اہم

شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ پورے نظام تعلیم میں اس کی حیثیت شودر کی سی ہوتی ہے جب کہ اس کی صحیح حیثیت یہ ہونی چاہیے کہ یہ سارے علوم کی ماں اور مرکز ومنبع ہو اور یہ یونیورسٹی کا اہم ترین اور مرکزی شعبہ ہو۔ اوٹی (Oriental Teachers) یا اسلامیات کے اساتذہ کی تنخواہیں دیگر اساتذہ کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں اور انہیں غیر اہم اور ادارے پر بوجھ سمجھا جاتا ہے۔

4۔ اس تعلیم کا نصاب اور اس کی تدریس اتنی غیر موثر ہے کہ یہ طالب علم میں نہ اللہ ورسولؐ کی محبت پیدا کرتی ہے اور نہ ان کی اطاعت کا جذبہ پروان چڑھاتی ہے، نہ ان میں آخرت کی فکر پیدا کرتی ہے اور نہ سچائی، دیانت داری، عدل، صفائی وغیرہ اسلامی اقدار ان میں منتقل کرتی ہے۔ بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

5۔ دینی مدارس میں بھی قرآن حکیم کی تدریس کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اکثر مدارس میں دورۂ قرآن کا اہتمام نہیں ہوتا (یعنی سارے قران حکیم کا ترجمہ وتفسیر نہیں پڑھایا جاتا) اور نہ وہاں شیخ القرآن یا شیخ التفسیر کا منصب رکھنے والا کوئی سینئر استاد ہوتا ہے جبکہ حدیث کے متخصص (شیخ الحدیث) اور فقہ کے متخصص (مفتی) اکثر بڑے مدارس میں موجود ہوتے ہیں۔

6۔ قرآن تزکیۂ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن اُس کی اِس حیثیت کو نہ دینی مدارس میں اہمیت دی جاتی ہے نہ خانقاہوں میں اور نہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔

7۔ دینی مدارس میں قرآن کے مقابلے میں حدیث کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور فقہ کو قرآن وحدیث دونوں پہ ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ محض اتہام نہیں، مدارس میں کتابوں کی تعداد اور پیریڈز کی تقسیم سے ہی اس کا ثبوت مل جاتا ہے اور طریقِ تدریس بھی اسی کا مظہر ہے کہ قرآن وحدیث کی تشریحات پر فقہی ومسلکی رنگ غالب ہوتا ہے۔

8۔ دینی مدارس اور مساجد میں 'دین' اور 'اسلام' کی تعلیم کے مقابلے میں 'مسلک کی تعلیم' کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہاں دین کے علمبردار نہیں مسلک کے سپاہی تیار ہوتے ہیں جو امت میں اتحاد واتفاق کے بیج بونے کی بجائے بدقسمتی سے فرقہ واریت اور مسلک پرستی کی افزائش کرتے ہیں اور ان میں سے کئی کمزور ایمان و کردار والے اُن اسلام دشمن قوتوں کی خفیہ ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جن کا ہدف ہی اسلام کی ہوا خیزی اور مسلمانوں کی تباہی اور رسوائی ہے۔

9۔ قرآن وسنت کا ایسا نصاب اور اس کی ایسی تدریس کہ قرآن وسنت آج کے مسلم معاشرے کے مسائل حل کرتے نظر آئیں، عنقا ہے۔ قرآن وسنت کے نصاب اور تدریس کا منہج ایسا ہونا چاہیے کہ ایک

طرف وہ نصوص قرآن وسنت کی تقلید کا شدید جذبہ پیدا کرے تو ساتھ ہی طلبہ میں ایسا رسوخ فی العلم اور ایسی مجتہدانہ بصیرت پیدا کرے کہ وہ آج کے مسلم معاشرے کو درپیش مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں سامنے لانے کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوں۔

10۔ دنیا کی غالب ملحدانہ مغربی تہذیب کے حوالے سے مطالعۂ اسلام کا صحیح اور متوازن منہج یہ ہونا چاہیے کہ مغربی فکر وتہذیب کا ناقدانہ مطالعہ کیا جائے۔اس کی غلط فکری اساسات پر عقلی وعلمی تنقید کی جائے اور انہیں انسانیت کے لیے ضرر رساں ثابت کیا جائے اور ان کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت اور اس کے اصولوں کی برتری بدلائل ثابت کی جائے۔اس کے لیے یونیورسٹی سطح پر متوازن نصابات کی تشکیلِ نو اور اعلیٰ سطح کی تحقیق ضروری ہے۔نہ تو یہ مناسب ہے کہ مغربی تہذیب کے ردعمل میں تحجر کا ثبوت دیا جائے کہ نہ تو مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ کیا جائے اور نہ انگریزی زبان سیکھی جائے جیسا کہ ہمارے دینی مدارس کا رویہ ہے کیونکہ جب تک ہم مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں کو سمجھیں گے نہیں، دلائل سے اسے غلط کیسے ثابت کریں گے؟ دوسری طرف ہماری یونیورسٹیوں کا رویہ بھی غلط ہے جو مغربی فکر وتہذیب سے متاثر اور مرعوب ہو کر اس کی تقلید اعمی شروع کر دیتی ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہوئے انہیں یہ یاد بھی نہیں آتا کہ ان کے اپنے بھی کچھ اصول واقدار ہیں جنہیں چھوڑ کر وہ اپنا نظریاتی وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتیں۔

خلاصہ یہ کہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہوں یا دینی مدارس، کسی جگہ اسلام کی ایسی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں ہے جس سے اس طرح کی متوازن شخصیت جنم لے سکے جو قرآن وسنت کو مطلوب ہے۔اس کے لیے اسلامی تعلیم وتربیت کے نصاب ونظام کی تشکیلِ نو کی اشد ضرورت ہے۔وتلک عشرة كاملة۔

عمرانی علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

1۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہمارا تصور دین مغرب کے تصور دین سے مختلف ہے۔عیسائیت میں انحراف کے نتیجے میں دین ودنیا کی تفریق شروع ہی سے گہری ہوگئی تھی جب کہ حضرت عیسیٰؑ معاشرے اور ریاست کے امور کو اس لیے زیر بحث نہ لائے تھے کہ وہ اس ضمن میں شریعت موسوی کے پابند تھے۔ جب کہ اسلام میں دین ودنیا کی یہ تفریق سرے سے پائی ہی نہیں جاتی بلکہ شریعت نازل ہی اس لیے ہوئی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ اور طریقہ سکھائے۔ چنانچہ جب ہم شرع اسلامی کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن وسنت کی بات کرتے ہیں تو سارے عمرانی علوم یعنی معاشیات، سیاسیات، سماجیات (سوشیالوجی وانتھروپالوجی) تعلیم، قانون، نفسیات، فلسفہ۔۔۔وغیرہ سب زیر بحث

آجاتے ہیں کیونکہ ان سب جہات اور علوم کے بنیادی مباحث قرآن وسنت میں زیر بحث آتے ہیں اور الٰہی تعلیمات کا ایک جزو ہیں۔

2۔ تاہم فرق یہ ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص منزّل من اللہ اور ناقابل تغیر ہیں اور ان میں عقل (Reason) کی مداخلت صرف ان کی تفہیم اور تطبیق کے حوالے سے ہے نہ کہ ان کی ساخت اور تغیر کے حوالے سے۔ اس کے برعکس عمرانی علوم میں انسانی عقل وتجربے کا دخل ہے۔ اس کے لیے شرع اسلامی نے یہ عدیم النظیر منہج اختیار کیا ہے کہ عمرانی علوم کے اصول ومبادی تو قرآن وسنت نے طے کردیے ہیں جو ناقابل تغیر ہیں اور اس کا تفصیلی ناک نقشہ عقل واجتہاد پر چھوڑ دیا ہے تاکہ زبان ومکان کی تبدیلیوں سے نمٹنے کی لچک اور صلاحیت موجود رہے اور تفصیلات کا تعین مقامی ضروریات کے مطابق ہوتا رہے۔ شرع اسلامی میں ناقابل تغیر اور قابل تغیر اصولوں کا یہ اجتماع اتنا مطابق عقل ومنطق اور عملی لحاظ سے اتنا سہل اور قابل عمل ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن وسنت نے معاشیات سے متعلق پالیسی اصول بیان کردیے ہیں اور یہ بات ہر زمانے اور عہد کے مسلم معاشرے اور ریاست (کے اہل علم) پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اس کی تفصیلات کا تعین کرلیں اور اسے ایک مربوط معاشی نظام کی شکل دے لیں۔

3۔ تفصیلات وضع کرنے کے اس کام کا صحیح منہج یہ ہے کہ یہ کام بہرحال ان اصول وضوابط کے تابع اور ان کی روشنی میں ہوگا جو وحی نے طے کردیے ہیں اور کسی صورت ان کی خلاف ورزی جائز نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے اسے اجتہاد کا نام دیا گیا ہے نہ کہ آزادانہ قانون سازی (legislation) اور رائے سازی کا اور اسی لیے ماہرین اصول فقہ نے اس کام کو مجتہدین تک محدود رکھا ہے اور مجتہد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت اور ان کے علوم کا ماہر ہو اور اسی لیے شرع اسلامی اور اصول فقہ کا یہ بنیادی قاعدہ ہے کہ نص کے خلاف اجتہاد یا اجماع ہو ہی نہیں سکتا۔ عقل واستدلال کے اس استعمال کی دوسری شرط یہ ہے کہ یہ مسلم معاشرے کے جائز، عملی، حقیقی اور ضروری مصالح کا تحفظ کرے۔

4۔ بلاشبہ اس اجتہادی عمل میں دوسری اقوام اور تہذیبوں کے تجربات سے بھی محدود استفادہ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ استفادہ شریعت کے اصول وضوابط اور ان کے مقاصد کے خلاف نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کا یہ عمل غالباً یا تو سابقہ شریعتوں کی تعلیمات ہی کی توسیع ہوگا یا عقل انسانی کی اختراع ہوگا اور انسانوں نے اسے اپنے لیے مفید پایا ہوگا اور ظاہر ہے اسلام عقل کے شریعت کے متابعانہ کردار (Role subordinate to Sharia) کو قبول کرتا ہے اور اسے رد نہیں کرتا لہٰذا یہ قابل

قبول ہونا چاہیے۔

5۔ تاہم اس اصول کے تحت اگر مغربی تہذیب سے استفادہ مطلوب ہو تو مزید احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ مغربی تہذیب کے بنیادی اصول (ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، ایمپر یسیزم، لبرلزم۔۔۔وغیرہ) اسلام بلکہ اصولاً سارے منزّل من اللہ ادیان کی نفی کرتے ہیں لہٰذا مغربی تہذیب کے کسی جزیے سے محتاط استفادہ بھی ڈرتے ہوئے اور انتہائی توجہ واحتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے خواہ وہ عقل اور انسانی تجربے سے مفید ہی کیوں نہ پایا گیا ہو۔اور پھر بھی ضروری ہوگا کہ جس جزیے سے استفادہ کرنا مطلوب ہے اسے پہلے مسلم مزاج وضروریات کے مطابق تبدیل کرلیا جائے اور پھر استعمال کیا جائے۔

6۔ اس اضافی اور انتہائی احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ مسلم تہذیب اس وقت مغلوب ہے اور سعئ ۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور یہ جدوجہد تبھی کامیاب، مفید اور منزل تک لے جانے والی ہوسکتی ہے جب یہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔دوسری طرف مغربی تہذیب نہ صرف اپنی فکری بنیادوں میں خلاف اسلام ہے بلکہ اس تہذیب کے علمبرداروں کی مسلم دشمنی بھی اظہر من الشمّس ہے اور اس نے غلامی کی پچھلی دو صدیوں میں مسلمانوں کو ذہنی اور فکری طور پر غلام رکھنے کے لیے مربوط اور کامیاب حکمت عملی اختیار کی ہے۔اس بناء پر مسلمان دانشور بسا اوقات اسلام کا نام لیتے ہوئے اور مغربی تہذیب کے خلاف بولتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر مغربی فکر وتہذیب ہی کے اصول ومظاہر کی حمایت کر رہے ہوتے ہیں لہٰذا مسلم امت کے دانشوروں اور حکمرانوں کو شعوری طور پر اور علی الاعلان پہلے مغربی فکر وتہذیب کی تغلیط کرنی چاہیے اور پھر اس سے کسی استفادے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

7۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الدین سردار اور بعض دوسرے دانشوروں نے اسماعیل راجی الفاروقی کے جدید سوشل سائنسز کی اسلامائیزیشن کے ورک پلان کو اسلام کی ویسٹرنائزیشن قرار دیا ہے اور ہمیں بھی اس میں وزن نظر آتا ہے کیونکہ مغربی سوشل سائنسز جس علمیاتی منہاج (Epistemological Paradigm) کی پیداوار ہیں وہ اپنی اصل میں اسلام مخالف ہے اور ان کی اسلامائیزیشن ممکن ہی نہیں لہٰذا ہمیں جدید مغربی سوشل سائنسز کی اسلامائیزیشن (Islamization of Western Social Sciences) کی بجائے سوشل سائنسز کی اسلامی تناظر میں تشکیلِ نو (Reconstruction of Social Sciences in Islamic Perspective) کی ضرورت ہے جس کا منہاج اوپر ذکر ہو چکا۔

سائنسی علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

1۔ خالص سائنسی علوم جیسے ریاضی، کیمیا، زراعت وصنعت وغیرہ خالص عقلی علوم ہیں جن میں وحی کی رہنمائی کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تعقل وتجربے کی صلاحیتیں زیادہ کام آتی ہیں لہٰذا ان کی اسلامی تشکیلِ نو کے لیے اس طرح کی جدوجہد کی ضرورت نہیں جس طرح کہ عمرانی علوم میں درکار ہوتی ہے۔ مغرب میں سائنسی ذہن کے غلبے نے ایسے علوم کو بھی جس میں انسانی تفکر و تدبر اور فلسفہ کا دخل ہے یا جس میں وحی کی ہدایت موجود ہے (جیسے نفسیات اور طبیعیات وغیرہ) ان کو بھی خالص سائنسی اور عقلی علوم قرار دے دیا ہے بلکہ وہ تو عمرانی علوم کو بھی 'سائنس' گردانتا ہے جو ظاہر ہے مبالغے پر مبنی ہے۔

2۔ تاہم اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ سائنس وٹیکنالوجی کے شعبوں میں کام کرنے والے افراد کا فکری سانچہ اور ان کا ورلڈ ویو ان کے کام کی نوعیت اور ان کے اہداف پر اثر انداز ہوتا ہے مثلاً تصویر نے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹی وی اور موبائل کے ذریعے جن انسانی اقدار کو رواج دیا ہے ان کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ یہ آلات اخلاقی لحاظ سے معروضیت اور غیر جانبداریت کے حامل ہیں بلکہ یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ ان کی تخلیق کے پس پشت وہ تہذیبی تصورات موجود ہیں جنھوں نے تصویر کے متنوع استعمال کو مغربی معاشرے کے لیے قابل قبول قرار دیا (اسلامی شریعت کے برعکس جو تصویر کی مذمت کرتی ہے)۔ اس حقیقت کو بعض نمایاں مغربی دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں۔

3۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی بھی جو بظاہر خالص عقلی وحسّی نظر آتی ہے بلا اقدار (Value-neutral) نہیں بلکہ جس فکری وتہذیبی پس منظر میں اور جس ورلڈ ویو کے تحت اس تہذیب کا فلسفۂ علم (Epistemology) پروان چڑھتا ہے اس کا رنگ اس کے علوم وفنون میں (خواہ سائنس و ٹیکنالوجی ہی کیوں نہ ہوں) ضرور نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم سائنسدانوں نے جس سائنس و ٹیکنالوجی کو جنم دیا اس نے ان کے تہذیبی مقاصد کو مجروح اور چیلنج نہیں کیا بلکہ وہ اس سے ہم آہنگ رہے۔ اسی طرح موجودہ مغربی تہذیب نے جس سائنس وٹیکنالوجی کو جنم دیا وہ اس کے تہذیبی مقاصد سے تو ہم آہنگ ہے لیکن اسلامی تہذیب کے اہداف و مقاصد سے ہم آہنگ نہیں جس کی فکری اساس اور اہداف مغربی تہذیب سے مختلف بلکہ متضاد ہیں لہٰذا وہ مسلم معاشرے کی ایمانی و اخلاقی اقدار کے لیے مضر اور نقصان دہ ہیں بلکہ ان کی نفی کرتی ہیں۔

4۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسلم امت اپنے نظام علم وتعلیم کی اصلاح کرے۔ سائنس وٹیکنالوجی میں بھی

مغرب کی اندھی پیروی سے باز آجائے اور اپنے تہذیبی پیراڈائم میں سارے علوم خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی کو فروغ دے اور عبوری دور میں مسلم عوام میں مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی غیر اسلامی اقدار کی پشت پناہی کے حوالے سے بیداری پیدا کرے تاکہ وہ اس کے استعمال کے نقصان دہ اثرات سے بچ سکیں۔

5۔ اس مغالطے اور غلط فہمی کا دور کرنا بھی ضروری ہے جو اکثر مسلم عوام و خاص میں موجود ہے کہ مغربی تہذیب کے غلبے و ترقی کا سبب سائنس وٹیکنالوجی میں ان کی ترقی ہے لہٰذا مسلم دنیا اگر ترقی اور غلبے کی خواہشمند ہے تو اسے بھی مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی پیروی کرنی چاہیے یا مغربی سائنس وٹیکنالوجی کو اپنے ہاں رائج کرنا چاہیے۔

اگرچہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہر قوم اپنے نظریاتی پیراڈائم میں رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہے اور خاص طور پر کسی ایسے فکری پیراڈائم کی پیروی کر کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جو اس کے نظریاتی پیراڈائم سے متصادم ہو بلکہ اس طرح کی پیروی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ضعف واضمحلال بڑھے گا کیونکہ بیک وقت دو متضاد فکری پیراڈائم پر عمل کے نتیجے میں اس کی شخصیت کی شکست وریخت ہوگی اور فکری انتشار اور ذہنی عدم آہنگی اسے لے ڈوبے گی۔ لہٰذا مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ اسلامی پیراڈائم کے اندر رہ کر کام کریں اور مغرب کے تہذیبی پیراڈائم کی پیروی نہ کریں۔ اگر وہ اس اصول کی خلاف ورزی کریں گے تو ناکامی اور شکست ان کا مقدر ٹھہرے گی اور ان کا نشأۃ ثانیہ کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

6۔ اگر سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت مغرب کی ترقی کا راز نہیں تو اس کی ترقی کا سبب کیا ہے؟ اس کے جواب میں کئی باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ **اولاً:** ہر تہذیبی منہاج میں 'ترقی' (Development) کا مفہوم الگ ہوتا ہے مثلاً اسلامی منہاج میں ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد اسلام کے انفرادی اور اجتماعی احکام پر کماحقہ عمل کریں گے تو وہ دنیا میں بھی سربلند ہوں گے اور آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے۔ آخرت کی قیمت پر یا اس سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے کوئی دنیاوی ترقی مسلم معاشرے کے لیے ترقی نہیں زوال کی علامت ہے (اور مسلم فرد کے لیے ترقی اور کامیابی یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے خواہ دنیاوی لحاظ سے وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو، تاکہ وہ آخرت میں کامیاب ہو سکے کیونکہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے نہ کہ دنیا کی کامیابی۔

ثانیاً: اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ ذرا گہرائی میں جا کر غور کریں تو اس بات کو پالیں گے کہ کسی بھی

علم وفن میں ترقی (جیسے کہ مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی ہے) کسی قوم اورتہذیب کے غلبے اورترقی کا مظہر ہوتی ہے اس کا سبب نہیں بلکہ اس کا حقیقی سبب ذرا پیچھے ہوتا ہے۔

قوموں کی ترقی اورعروج وزوال کے حوالے سے جو اصول ہمیں قرآن وسنت سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل اہمیت 'فرد' یا ''آدمی'' کی ہوتی ہے اور قوموں اور تہذیبوں کی ترقی میں بنیادی کردار ''آدمی'' ادا کرتا ہے۔ اس کی عقلی توجیح یہ ہے کہ کسی نظریے سے شدت کے ساتھ وابستگی فرد کے اندر وہ صلاحیتیں پروان چڑھاتی ہے جو دنیا میں ترقی کے لیے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت ایثار وقربانی، تنظیم اور منصوبہ بندی، قانون کی پاسداری، اطاعت امیر۔۔۔۔وغیرہ۔ اگر یہ نظریہ صحیح، تعمیری اور مثبت ہو تو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی ہوگی اور اگر غیر صحیح اور بنائے فاسد پر استوار ہو تو دنیا میں عارضی کامیابی وترقی تو ملے گی جو جلد یا بدیر فساد فی الارض میں تبدیل ہوکر غتر بود ہو جائے گی اور آخرت میں خسارے کا سبب بنے گی۔

مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک جو ترقی کی وہ اسلام کی صالح بنیادوں پر مبنی تھی لہٰذا مسلم معاشرے نے ترقی کی اور مخلص ومتقی افراد آخرت میں بھی کامیاب وکامران ہوں گے۔ مسلم معاشرے نے جب اسلام کے ساتھ حقیقی وابستگی کھودی تو وہ زوال پذیر ہوگیا لیکن افراد میں سے جنھوں نے اسلامی تعلیمات پر کماحقہ عمل کیا آخرت میں ان کا اجر محفوظ ہے۔ اس اثناء میں مغربی قومیں ابھریں جو اپنے غیر اسلامی نظریۂ حیات سے شدت سے وابستہ تھیں لہٰذا اس وابستگی کے نتیجے میں ان میں وہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں جو دنیا میں ترقی کے لیے ضروری ہیں —— اور آخرت میں کامیابی ان کے پیش نظر تھی ہی نہیں۔ چونکہ ان کے مقابلے میں صالح نظریۂ حیات پر عامل کوئی قوت ان کی ٹکر کی موجود ہی نہ تھی لہٰذا انہیں دنیا میں غلبہ حاصل ہوگیا۔

اب اگر مسلمان دنیا میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات کے ساتھ شدت سے وابستہ ہو جائیں جس کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے نظام تعلیم وتربیت و میڈیا یعنی ذہن سازی اور تعمیر شخصیت کے بنیادی ذرائع کو بدلیں اور اسلامی تقاضوں کے مطابق ان کی تشکیلِ نو کریں تاکہ وہ 'فرد' تیار ہو سکے جو اسلام کو مطلوب ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا مغرب کی پیروی ہمارے زوال کو مزید گہرا کرے گی اور ہم مسلم نشأۃ ثانیہ کی منزل سے مزید دور ہوں گے۔

جَو بو کر گندم کاٹنے کی خواہش

ہمیں ان مسلم حکمرانوں اور دانشوروں پر حیرت ہوتی ہے جو مغربی علوم اور مغربی طرز کی تعلیم اپنے

اداروں میں دے کر یہ توقع کرتے ہیں کہ ان سے جو نسل نکلے گی وہ اچھی انسان اور اچھی مسلمان ہوگی۔ وہ ایماندار اور بااخلاق و باکردار ہوگی، رذائل اخلاق سے مبرا ہوگی اور فضائل اخلاق سے مزین ہوگی۔ اور اس سے بڑھ کر حیرت ہوتی ہے اُن دین دار لوگوں پر جو کمرشلزم اور مادہ پرستی کی دوڑ میں مبتلا ہو کر تعلیم کو ایک کاروبار بنا لیتے ہیں اور مغرب کے سماجی اور سائنسی علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور طلبہ و طالبات کی اسلامی تربیت کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اسلام کا کارکن اور علمبردار بھی کہتے ہیں اور ان کے ضمیر ذرا بھی کسک محسوس نہیں کرتے کہ وہ مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیم نہیں دے رہے بلکہ مغربی علوم و اقدار کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرانی ہمیں ان دینی لوگوں کو دیکھ کر ہوتی ہے جو دینی مدرسے چلاتے ہیں اور ان کے پیش نظر نفع اندوزی بھی نہیں لیکن مغربی تہذیب و تعلیم سے اتنے ناواقف یا اس سے اتنے مرعوب ہیں کہ قوم کے بعض بچوں کو الٹرا ماڈرن مغربی علوم اور انگریزی طرز کی تعلیم دیتے ہیں اور اسے بھی اسلامی لحاظ سے ''کارنامہ'' سمجھتے ہیں کہ وہ قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ کیسا زہر ان بچوں کی رگوں میں اتار رہے ہیں کیونکہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ذریعے مغرب کے مرتب کردہ سماجی و سائنسی علوم پڑھا کر یہ سمجھنا کہ ان کا زہر طلبہ پر اثر نہیں کرے گا، پرلے درجے کی سادہ لوحی ہے یہ جَو بو کر گندم کاٹنے کی خواہش کرنا ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔

مغربی علوم کی تعلیم اور مغربی طرز کی تعلیم ہرگز اسلامی شخصیت پیدا نہیں کرسکتی خواہ اس پر کتنے ہی اسلامی لیبل لگا لیے جائیں اور اس کا خواب وہی دیکھ سکتا ہے جو مغرب کے ورلڈ ویو اور اس کے فلسفۂ علم سے ناواقف ہو اور ان چیزوں کے نصاب و نظام تعلیم پر اثر انداز ہونے کے عمل سے بے بہرہ ہو۔

تلخیص مباحث

ان مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان دنیا میں ترقی و سربلندی اور آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں تو اس کی بنیادی ضرورت ایسے فرد کی تیاری ہے جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام علم و تعلیم و تربیت کی اسلامی تشکیلِ نو کریں اور ایسا کرتے ہوئے مغربی فکر و تہذیب کو رد کریں کیونکہ اس کی پیروی داء (بیماری) ہے دوا نہیں۔ اس سے ہمارے مرض غلامی و نفاق میں اضافہ ہوگا نہ کہ افاقہ۔

تعلیم و تربیت　　　　افتخار الدین منصور

ہماری منزل تخلیق علم ہونی چاہیے
محض حصول علم نہیں

پاکستان میں تقریباً تمام مسلمانوں کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ ذہنی مرعوبیت کا ہے۔ ایک مسلمان جب اپنے ماحول میں گردوپیش نظر دوڑاتا ہے تو اسے زندگی کا پورا نقشہ افرنگی طرز پر بنا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی آمدورفت کے تمام ذرائع سائیکل، موٹر سائیکل، گاڑی، ریل کار، ہوائی جہاز و ہیلی کاپٹر تمام کے تمام افرنگی ایجادات ہیں۔ اس کے گھر کے اندر باورچی خانہ کی چھوٹی بڑی ضروریات، چولہے سے لے کر پینے بنانے کے تمام آلات، گھر کی دیگر ضروریات مثلاً پنکھے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ائیر کنڈیشنرز، یہاں تک کہ اس کے غسل خانہ میں رفع حاجات کے کموڈ تک افرنگی ذہن کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، جہاں وہ کام کر کے روزی کماتا ہے وہاں کی ہر چیز افرنگ سے آئی ہوئی ہے، کرسی میز سے لے کر کام کے سلسلہ میں استعمال ہونے والے تمام برقی و غیر برقی آلات، ٹائپ رائیٹرز، فوٹو کاپیئرز، فیکس مشین، کمپیوٹرز وغیرہ نہ صرف افرنگی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر افرنگ سے ہی بن کر آتی ہیں۔

آزاد حکومت اور ملکی دفاع کا یہ حال ہے کہ نہ صرف ہماری افواج کا لباس اور تربیت افرنگی اصولوں پر مرتب کیے گئے ہیں، جارحیت ہو یا دفاع، ان میں استعمال ہونے والے قریب قریب تمام ہتھیار افرنگی ٹیکنالوجی کے شاہکار ہیں۔ ہم ان میں سے بہت سے ہتھیار انہی کے اصولوں پر خود بھی بنا لیتے ہیں لیکن افرنگی، جو تخلیقِ علم کے میدان میں ہم سے کوسوں آگے ہیں، آئے دن نت نئے ہتھیار ایجاد کرتے رہتے ہیں جن کا توڑ ہمارے پاس نہیں ہوتا تاآنکہ وہ خود ہی ان ہتھیاروں کو تجارتی منڈیوں میں رکھ دیں اور ہم انہیں خرید کر نقل کر کے اپنے لیے بنا لیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے پاس ہر وہ مشین یا ہتھیار ہے جو افرنگیوں کے پاس ہے۔ نہیں! انہوں نے بہت سے مہلک ترین ہتھیار اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں جن کی ہمیں بھنک تک نہیں پڑی ہوتی۔

زندگی کا کوئی میدان ہو، سمندروں کو کھنگالنا ہو یا فضاؤں کو اجالنا ہو، زندگی کا کوئی جلی و خفی پہلو لے لیں، حیات، کلاں ہو یا خورد، ہاتھی سے لے کر خوردبینی جرثوموں تک، ہر تحقیقی میدان میں افرنگیوں کے

نقوشِ پا آپ کو سب سے آگے نظر آئیں گے۔ ہم ابھی پدرم سلطان بود کے سحر ہی سے نہیں نکل پائے۔ علم کے کسی میدان کی بات ہو ہم ابوالہیثم اور ابن سینا قسم کے ناموں کی رٹ لگا دیں گے کہ افرنگیوں نے انہی سے نقل کیا۔ چلیے نقل کیا!۔۔۔۔ لیکن وہ انہی علوم کو اٹھا کر جن بلندیوں تک لے گئے ہماری تو نظر ان تک پہنچنے کی راہ سے تھک ہار کر واپس لوٹ آتی ہے۔ ہم تو خود اُن سب کو بھلا کر عدم و نیستی کے کسی اندھے کنویں میں جا دبکے ہیں اور علم و تحقیق کے کسی میدان میں ہمارا کوئی قابل لحاظ وجود موجود ہی نہیں۔

ماحول ہی نہیں اس کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اس کی بود و باش، اس کے لباس تک کی تراش خراش، پاپوش سے لے کر گلے میں لٹکنے والی صلیب (نکٹائی) تک افرنگی ذہنی اثر کا پتہ دیتی ہے۔ ہمارے مقتدر طبقہ کی اکثریت ذہناً افرنگی ہے جبکہ ہمارے دینی طبقہ کے بہت سے لوگوں کی شخصیتیں مرعوبیت کا شکار ہیں۔ اکثر آپ کو چہرے پر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سجی ہوئی نظر آئے گی اور گلے میں صلیب لٹک رہی ہوگی۔ بڑے بڑے جغادری مسلمان، ذرا کرید کر دیکھیے تو افرنگ کے ثناء خوان نظر آئیں گے۔

یہ ایک فطری سی بات ہے جب آپ کی بود و باش افرنگی انداز پر ہو، آپ اپنا دفاع انہی سے منگا ئے ہوئے اسلحہ سے کرتے ہوں، جب آپ اپنی روزی انہی کے بنائے ہوئے ضابطوں سے حاصل کرتے ہوں، جب آپ کی تعلیم انہی کے علوم کی نقالی پر مبنی ہو، جب آپ کے کان انہی کے ذرائع ابلاغ کے پھیلائے ہوئے خیالات کو سنتے ہوں اور آپ کی آنکھیں انہی کے دکھائے ہوئے مناظر کو دیکھتی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے ذہن کسی بھی انداز میں آزادانہ سوچ کے حامل ہو سکیں؟ ہمارے سیاستدان خواہ وہ دینی ہوں یا بے دین، انہی کی بتائی ہوئی طرز حکومت، جمہوریت، کے پیروکار ہیں۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ افرنگی نظام جمہوریت کو اسلام کا لبادہ پہنا دیا، بلکہ رٹ یہ لگا دی کہ یہ جمہوریت تو اصل میں انہوں نے ہم سے سیکھی۔ ہم اپنی جہالت میں اس درجہ بے بس ہوئے کہ ایک خدا سے باغی متکبر انسان کے نظام حیات اور خدا کے سامنے جھکنے والے فروتن انسان کے نظام حیات میں فرق ہی نہ کر پائے۔ کہاں خاک، کہاں عالم پاک اور پھر اس جمہوریت کے ساتھ مادر پدر آزاد سرمایہ داری کے نظام کو بھی ہم نے من وعن قبول کر لیا۔ وہ جو قومِ رسول ہاشمی کا مزاج تھا، تاریخ کے حوالے ہوا اور ہم نے جدید اجتہاد یا اسلام کے لبادے میں ایک نئی جہت، ایک نئے مزاج اور ایک نئے مقصد کو اپنا لیا۔ یہ سب کچھ ہماری ناسمجھی سے ہوا۔ ہم یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ اس جمہوریت و سرمایہ داری کے طفیل ہم اس مزاج اور اس رویے کو خیر باد کہہ رہے ہیں جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ غرض ہم اپنی نجی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے تمام اظہارات تک وہی کرتے ہیں جو افرنگی ہم سے چاہتے ہیں۔ ہماری خارجہ حکمت عملی بھی کھربوں روپوں

کے خسارے اور ہزاروں افراد کی قربانی کے باوجود افرنگی مفادات کو آگے بڑھانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہمارا دینی طبقہ کبھی نیچے کبھی اونچے سروں میں مخالفت کے باوجود مکمل طور پر بے اثر ہے۔

ایسے میں ہمارے ایک عام آدمی سے جو جاہل یا نیم پڑھا لکھا ہے اور جسے عموماً معاشی استقلال بھی حاصل نہیں، یہ توقع آخر کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ کبھی اپنے ذہن سے سوچنے کے قابل ہوسکتا ہے؟ ہمارا مقتدر طبقہ جن لوگوں کی اولادوں پر مشتمل ہے ان کی ذہنی آبیاری خود افرنگیوں نے اپنے نو آبادیاتی قبضہ کے دوران کی۔ انہی کی نسلیں ہمارے ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں۔ ان سب کی اکثریت بے دینی کی علمبردار ہے۔ یہ حضرات اوّل تو تعلیم کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے، اور جو ناقص تعلیمی نظام موجود بھی ہے اس میں بھی یہ اصحاب اپنے آقاؤں کی ہدایات کے مطابق افرنگی نظریات کی ترویج کرتے ہیں۔ تعلیمی نظام کو دینی اثرات سے پاک کرنا، اباحیت کو دبے پاؤں آنے دینا انگریزی کو نشست حاکمیت پر بٹھائے رکھنا ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ ان حالات میں کسی نوع کی ذہنی آزاد روی یا مستقبل میں ایسی کسی صورت کے پیدا ہونے کا دور دور تک کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

جب قوم کی غالب اکثریت ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو، جہالت عام ہو، معاشی میدان میں ہمارا انگ انگ بیرونی واندرونی قرضوں کے شکنجے میں کسا ہو، سیاسی حالت انتشار میں مبتلا ہو اور امن وامان کی صورت حال بھی مخدوش ہو تو کیا مستقبل کے بارے میں مایوسی کے علاوہ بھی کوئی راہ ان حالات سے نکلنے کی ممکن ہے؟ ایک راہ، البتہ، ایسی موجود ہے جسے اختیار کرکے ہم یقینی طور پر ان حالات سے نکلنے کی سبیل پیدکر سکتے ہیں اور وہ راہ ایسی ہے جس کا حصول ہم اپنے وسائل سے ممکن بنا سکتے ہیں اور وہ راہ صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے تخلیق علم!

تخلیق علم ہی وہ راہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنی بنیادی کمزوری کو ختم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم تخلیق علم پر قادر ہوسکیں تو افرنگ کے مقابلہ میں فدویانہ جھکی نظروں سے غلامانہ تعریفی کلمات کی ممیاہٹ کے بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آزادروی کی بلند آہنگی سے پُر اعتماد رویے کو جنم دیا جاسکتا ہے۔ ہم افرنگ کے ساتھ تخلیقی عمل میں ساجھی ہوئے بغیر نہ اپنی دل گیری ختم کر سکتے ہیں اور نہ دنیا میں کوئی مقام پیدا کر سکتے ہیں۔

تخلیق علم کے لیے پہلا مرحلہ حصول علم کا ہے۔ حصول علم سے مراد دوسروں کی زبانوں میں رٹا ہوا علم نہیں، دوسروں کی زبانوں میں رٹا ہوا علم، علم نہیں وہ تو معلومات کا ذخیرہ ہے۔ جسے ہم اپنے ذہن کے تاریک خانوں میں بھر دیتے ہیں۔ اس علم میں اور کتابوں میں لکھے علم میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے

مہندسین ساٹھ سالوں سے جن مشینوں کو ان کے تیار کنندگان کی لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق چلاتے آرہے ہیں، جب کبھی ان کی کارکردگی بہتر کرنے کا مرحلہ آتا ہے یا ان میں کوئی خرابی آتی ہے تو انہیں درست کرنے کے لیے ورلڈ بنک سے قرضہ لے کر افرنگی مہندسین بلائے جاتے ہیں۔ ذہن کی دو پرتوں کے درمیان انگریزی میں رٹا ہوا علم اور کتابی علم جلد کی دو پرتوں کے درمیان لکھے ہوئے علم میں کوئی فرق نہیں۔ ضرورت پڑنے پر اسے ذہن سے نکال لیں یا کتاب کھول کر پڑھ لیں، مطلب برآری کے لیے یکساں ہے۔ تخلیق علم نہ کتابی علم سے ممکن ہے، نہ رٹے ہوئے علم سے۔ علم وہ ہے جو ہماری جان کا حصہ بن جائے۔ ایسے ہی جیسے زرگل شہد کی مکھی کی جان کا حصہ بن جاتا ہے پھر وہ شہد اگلتی ہے جو اپنے اندر مسیحائی کا درجہ رکھتی ہے۔ محض معلومات کی جگالی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں مروجہ علوم کو اپنی زبان میں اپنی جان کا حصہ بنانا ہے، تبھی وہ ہماری معاشی، معاشرتی اور سیاسی مشکلات کا حل پیش کر سکیں گے۔

اس کے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اداروں میں طلباء کو حصول علم کے لیے تیار کریں۔ انہیں مناسب مواد بہم پہنچانے کے لیے مروجہ بین الاقوامی علوم کے تمام شعبہ جات کی نمائندہ کتب کو اپنی زبان میں منتقل کر دیں اور نئی ایجادات و انکشافات پر مشتمل رسائل کو تسلسل کے ساتھ ترجمہ کر کے شائع کرتے رہیں تو بہت جلد ہم سیکھے ہوئے علم کی اس حد تک پہنچ جائیں گے جس سے تخلیق علم کی منزل دو چار گام ہی ہوا کرتی ہے۔ جس طرح ایک جسم، عمر اور صحت کی ایک حد کو، جسے بلوغت کہتے ہیں حاصل کر کے تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہو جاتا ہے اسی طرح کسی بھی شعبۂ علم میں سمجھی ہوئی معلومات کے حصول کی ایک ایسی سطح بھی ہوتی ہے جس کے آگے تخلیق علم کی راہ کھلتی ہے۔ ذہن نئے اور اچھوتے خیالات کی پیدائش کے قابل ہو جاتا ہے اور ایجادات و انکشافات کی ایک دنیا اس کے سامنے ہو جاتی ہے۔

اگر ہم یہ کر سکیں، اگر ہم حصول علم کو تخلیق علم کی حدوں تک لے جائیں تو بہت جلد ہم مرعوبیت کے بند گنبد سے نکل کر لا انتہا امکانات کے کھلے آسمان کے نیچے آجائیں گے، جہاں ہم تخلیق علم کی دوڑ میں افرنگ کا مقابلہ کر سکیں گے، پھر معاملہ صرف لینے کا نہیں، لینے اور دینے کا ہوگا۔ پھر ہماری نظریں بھی اعلیٰ مقاصد کی بلندیوں پر ہوں گی، اس دوڑ میں کبھی وہ آگے اور کبھی ہم آگے ہوں گے۔ یہ دوڑ کسی کا پیچھا کرنے کی نہیں، مسابقت کی دوڑ ہوگی۔

یہی وہ راہ ہے، تخلیق علم کی راہ، جس پر چل کر ہم اپنی ذہنی غلامی، اپنی پس ماندگی، اپنی ذلت و ادبار سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ پہلی بار نہیں کہ ہم یہ کرنے جا رہے ہیں، ہم ایک عرصہ تک دوسرے تمام میدانوں کی طرح علمی میدان میں بھی پیش قدم

رہے ہیں۔ اگر ہم آج ارادہ کریں تو اس کھوئے ہوئے مقام کو بآسانی دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

تعلیم و تربیت　　مولانا مفتی عبدالواحد

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم
البرہان کے مولانا مدنیؒ نمبر پر تبصرہ

محترم جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب ''البرہان'' کے نام سے کئی سالوں سے ایک ماہنامہ نکال رہے ہیں۔ جون 2013ء کے شمارے میں انہوں نے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ قدیم و جدید علوم کا جامع نصاب شائع کیا اور اس پر انہوں نے ہم سے تبصرہ کرنے کو کہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بقول یہ نصاب 1933ء میں مدون ہوا تھا۔ وہ فرماتے ہیں: ''جب ہم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا قدیم و جدید پر مبنی یہ نصاب دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر دینی مدارس کا نصاب تبدیل نہ ہوسکا اور کس طرح حالات کا جبر ہمارے دینی نظامِ تعلیم کو متوازن بنانے میں حائل رہا''۔

البرہان میں ڈاکٹر صاحب اس کی اشاعت کی یہ غرض بتاتے ہیں: ''مولانا مدنیؒ کا مرتب کردہ قدیم و جدید کا جامع نصاب ہم البرہان کی خصوصی اشاعت کی صورت میں اہل علم، دینی مدارس اور خصوصا دیوبندی علماء کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تا کہ وہ اس پر غور فرمائیں اور مناسب سمجھیں تو مولانا مدنیؒ کی اتباع میں اپنے مدارس کے موجودہ نصاب و نظام پر نظر ثانی فرمائیں۔۔۔۔ پھر ہم کوئی نئی بات بھی نہیں کہہ رہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ علماء کرام کو موجودہ تعلیمی ثنویت ختم کر کے وحدتِ تعلیم کے اس نظام کی طرف لوٹ جانا چاہیے جس پر ہمارے اسلاف صدیوں عمل پیرا رہے ہیں اور معاشرے اور مسلم ریاست کے لیے رجال کار تیار کرتے رہے ہیں''۔

اپنی بات کی تائید میں ڈاکٹر امین صاحب نے یہ حوالے بھی دیے ہیں:

i۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حالات زندگی ''سوانح قاسمی'' میں تفصیل سے لکھا ہے کہ مولانا کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ مسلم طلبہ دینی تعلیم کے بعد جدید تعلیم ضرور حاصل کریں اور انہوں نے دیوبند کی مدت نصاب کو دس سال سے کم کر کے چھ سال اسی لیے کیا تھا کہ طلبہ جدید تعلیم حاصل کر سکیں اور خود بھی انہوں نے حج سے واپسی پر انگریزی سیکھنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن زندگی

نے انہیں مہلت نہ دی۔

ii۔ دیوبند کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی فلسفہ و منطق وغیرہ قدیم معقولات کی تعلیم کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہوئے اس کے مقابلے میں انگریزی تدریس کی حمایت کرتے تھے۔

iii۔ سید انور شاہ کشمیریؒ جدید فلسفہ و ہیئت کی تدریس کے بھی حامی تھے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے تجویز کردہ نصاب کے تین حصے ہیں جن کے لیے مجموعی حیثیت سے سولہ برس کی مدت ضروری خیال کی گئی ہے۔

(۱)۔ مکتب یا حصہ ابتدائیہ۔اس کی تعلیم تین سال ہے اور اس میں وہ فنون اور کتب واعمال رکھے گئے ہیں جو کہ ہر مسلمان کے لیے بحیثیت مذہب وانسانیت نہایت ضروری ہیں۔

(۲)۔ جونیئر یا مدرسہ ثانویہ کی مدت تعلیم پانچ سال ہے۔اس درجے میں وہ علوم وفنون والسنہ وکتب تجویز کی گئی ہیں جو کہ مذہبی ودنیاوی زندگی کی ضروری آسانیاں پیدا کرنے والی ہیں۔

(۳)۔ سینیئر یا درجہ عالیہ کی مدت تعلیم آٹھ سال ہے۔اس کا غالب عنصر عربی فنون اور دینی علوم کا اہم اور مفید ذخیرہ ہے۔

نوٹ: اس نصاب کے بعد تکمیل کے درجات ہوں گے۔ان میں فتاویٰ، ادبیات عربیہ، ادبیات اردو، ادبیات فارسی، ادبیات انگریزی، الجبرا، ہندسہ وریاضی، علم طب، علم قراءت، فلسفۂ قدیم وجدید، منطق اور تفسیر وغیرہ کی تکمیل کا لحاظ کیا جائے گا۔ان کی تفصیل ابھی نہیں دی گئی اور ظاہر ہے کہ یہاں طب سے مراد MBBS اور ادبیات سے مراد MA نہیں ہے۔

نوٹ: ہر تین برس میں اس نصاب پر غور کرنا ہوگا اور حسب ضرورت وتقاضائے وقت وتجربہ ضروری اصلاحات اور ترمیمات عمل میں لانا ہوں گی۔

مولانا مدنیؒ کے تجویز کردہ نصاب کی کتب کی تفصیل۔

دینیات

قرآن پاک کو عملی تجوید کے ساتھ پڑھنا، پورے قرآن پاک کا ترجمہ، **تعلیم الاسلام، علم الفقہ، عقائد اسلام (مولانا عبدالحق حقانی)، مدارج القراءۃ، باب اول ملتقی الابحر کتاب الصلاۃ، اربعین نووی، اصول شاشی، شرح نقایہ یا شرح وقایہ، نور الانوار**

کامل، کتاب الآثار امام محمد، تفسیر عزیزی پارہ ۱ ، ۲۸ ، ۳۰۔ توضیح کامل، هدایه اولین، سراجیه، شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر (اردو) ، جلالین، هدایه آخرین، شرح مسلم الثبوت بحر العلوم، شرح عقائد نسفی، شرح نخبة الفکر، شمائل ترمذی، شفا قاضی عیاض، مشکوۃ، مسامرہ شرح مسایرہ، شرح عقیدہ طحاویه، بیضاوی، صحاح سته، حجة اللہ البالغه، بدایة المجتهد ابن رشد

عربی علوم وفنون

علم الصرف ،عربی صفوة المصادر، صرف میر، نحو میر، دروس الادب، دستور المبتدی، مراح الارواح، الدروس العربیه، الفیه ابن مالک، نفحة الیمن، ازهار العرب، فصول اکبری، تلخیص المفتاح و مختصر المعانی، دیوان متنبی، دیوان حماسه، المحاسن و الاضداد للجاحظ

منطق وفلسفہ

تیسیر المنطق، ایساغوجیِ قال اقول، مرقات، شرح تهذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، تصریح الافلاک، هدیه سعیدیه۔

جدید تعلیم

ادبیات اردو، تاریخ اسلام، معاشیات، جغرافیہ، ریاضی، انگریزی زبان۔

ہم کہتے ہیں:

وفاق المدارس کا جو موجودہ نصاب ہے اس میں آٹھویں بلکہ میٹرک بھی عملی شرط بن گیا ہے۔ میٹرک تک کی تعلیم میں تمام ضروری عصری علوم کی وہ حد بھی آجاتی ہے جو مولانا مدنی رحمہ اللہ نے درج کی ہے۔ اور اب تو حکومت سکول کی تعلیم میں انگریزی زبان کی حیثیت کو بڑھا رہی ہے جس سے ظاہر ہے کہ مدارس کے نصاب پر بھی جلد یا بدیر اثر پڑے گا۔

منطق کی تعلیم اب وفاق میں بھی سلم العلوم تک بلکہ وہ بھی ختم ہو کر قطبی تک رہ گئی ہے اور قدیم فلسفہ میں بھی ہدیہ سعیدیہ یا میبذی رہ گئی ہے۔ تاریخ اسلام پر بھی وفاق نے توجہ زیادہ کی ہے۔ قرآن پاک

کے ترجمہ وتفسیر کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔وفاق کے نصاب میں باقی دینیات کی کتب تقریبا وہی ہیں جو حضرت شیخ الاسلام نے تجویز کی ہیں۔

ان اقدامات اور تبدیلیوں کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مدنیؒ کے تجویز کردہ نصاب کو وفاق کے فیصلوں کی وجہ سے تقریبا تمام مدارس نے قبول کرلیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہیں بلکہ مدارس اب اس سے بھی آگے جارہے ہیں۔

1۔ جامعۃ الرشید نے گریجویٹس کے لیے کلیۃ الشریعہ قائم کیا ہے جو تقریبا دس سال سے چل رہا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ قدیم وجدید کا بڑے پیمانے پر اجتماع ہے۔

2۔ جامعۃ الرشید میں ہی مدارس سے فارغ ہونے والوں کے لیے کئی قسم کے علوم کے کورس کرائے جاتے ہیں مثلاعلم ہیئت،جغرافیہ،صحافت،بزنس ایڈمنسٹریشن،انگریزی۔

3۔ جدید معاشیات میں داخل ہونے کی وجہ سے اب مدارس میں انگریزی اور تجارت ومعاشیات کے تصورات کو سمجھنے کی محنت ہونے لگی ہے۔

4۔ وفاق کی کی جانب سے دنیوی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے تین سالہ کورس چلایا ہوا ہے۔

5۔ وفاق ہی کی جانب سے بچیوں اور خواتین کی دینی تعلیم کا نظام ونصاب بنایا گیا ہے اور ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔

6۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے فہم دین کے نام سے ہم نے بھی اسلامیات کا فہم دین کورس کے نام سے چند کتابوں پر مشتمل ایک جامع نصاب ترتیب دیا ہے جو بازار میں بآسانی دستیاب ہے۔

آخری بات

اگر محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کو پھر بھی کچھ کمی نظر آتی ہے تو وہ اپنا نقطہ نظر وفاق والوں پر بالمشافہ واضح کرسکتے ہیں۔امید ہے کہ ایسی صورت میں اختلاف باقی نہ رہے گا۔

میڈیا مدیر

پاکستانی میڈیا

بکاؤ مال اور مخالف اسلام و پاکستان

آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل پاشا صاحب کے جو بیانات مبینہ ایبٹ آباد کمیشن کے حوالے سے منظر عام پر آئے ہیں ان میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے میڈیا کے بہت سے افراد ڈالر اور شراب کے عوض بکنے کے لئے ہر وقت تیار ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ کا یہ انکشاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر حکومت پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں جانتی ہیں کہ کون کون سے صحافی اسلام اور پاکستان دشمن غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں تو ان کے خلاف ان ایجنسیوں نے کیا ایکشن لیا ہے؟

اگرچہ بدقسمتی سے اس حمام میں اکثر ننگے ہیں۔ وہ حکمران بھی جو ایک فون کال پر امریکہ کے آگے ڈھیر ہو جاتے ہیں اور وہ عسکری قیادت بھی جو ان کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ سیاست دان بھی جو کافر اور دشمن ہمسایہ ملک کے کہنے پر ڈیم نہیں بننے دیتے اور ملک و قوم کو لوڈ شیڈنگ کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں اور وہ بھی ''جو اُدھر تم اِدھر ہم'' جیسے نعرے لگا کر اس لئے ملک توڑ دیتے ہیں کہ دوسرے صوبے میں ان کو اقتدار نہیں مل سکتا۔ اسی طرح وہ میڈیا گروپ جو فحاشی و عریانی اور ناچ گانے کو پروان چڑھاتے ہیں، اسلام کی اخلاقی قدروں کو تباہ کرتے ہیں اور علاقے میں امریکی و بھارتی پالیسیوں کو آگے بڑھاتے ہیں، ان کے اسلام اور پاکستان کے غدار ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے گریبان پر ہاتھ کون ڈالے؟ یہ اصول کی بات ہے اور دنیا کی ریت بھی ہے کہ بدکار پر پہلا پتھر وہی پھینکے جو پاکباز ہو۔

یا اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما، ہمیں ہر مصیبت اور پریشانی سے بچا، اسلام، نظریۂ پاکستان اور وطن عزیز کی حفاظت فرما، ہمیں محب اسلام اور محب پاکستان حکمران عطا فرما جو زندگی کے سارے شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق چلائیں، خصوصاً میڈیا کو غیر اسلامی اور غیر ملکی اثرات سے پاک کریں اور اس سے اسلامی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کا کام لیں تاکہ یہ وطن عزیز جنت کا گہوارہ بن سکے۔

پروفیسر ملک محمد حسین

انتخابات2013ء

مدیر البرھان کے تجزیے کا محاکمہ

دینی سیاسی جماعتوں کی شکست

ذمہ دار وہ خود ہیں نہ کہ امریکہ و مغرب

محترم مدیر البرہان نے 'فکر و نظر' کے مستقل عنوان کے تحت مئی کے شمارے میں انتخابات 2013ء پر خیال آرائی فرمائی ہے۔ مدیر موصوف نے 'عملی پہلو' کے ذیلی عنوان سے امریکی غلامی، تبدیلی کا بند راستہ اور عدلیہ کے سیکولر کردار کے ذیلی نکات کے تحت جن نمایاں باتوں کو اجاگر کیا ہے ان میں نام نہاد انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ، سٹیٹس کو، خفیہ ہاتھ، انتخابات کے انجینئرڈ نتائج اور اسی طرح کی روایتی باتیں کی ہیں جو ہارنے والی مذہبی سیاسی جماعتیں اپنی خفت مٹانے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ آپ نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ امریکی سازش کے تحت تحریک انصاف، جماعت اسلامی اور متحدہ دینی محاذ نیز ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو شکست دلائی گئی ہے اور نواز شریف کو تازہ دم امریکی گھوڑی کے طور پر جتوا کر حکومت میں لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب 'تبدیلی کے بند راستے' کے تحت فرماتے ہیں کہ ''جمہوری سسٹم عمداً ایسا بنایا گیا ہے (دولت، برادری، جاگیرداری، کم شرح تعلیم، متوسط طبقے کو غیر موثر رکھنا، اہلیت کی اسلامی دفعات پر عمل نہ ہونے دینا، دینی عناصر کو مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنانے اور الیکشن لڑنے کی اجازت دینا، انہیں باہم لڑانے اور متحد نہ ہونے دینے کا بخوبی انتظام۔۔۔ وغیرہ'' کہ کوئی دینی سیاسی جماعت اس میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

مدیر البرہان کی آراء کا جو خلاصہ ہم نے خود ان کے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دینی سیاسی عناصر انتہائی احمق، سطحی سوچ کے حامل، انتہا پسند اور دشمن کا برضا و رغبت آلہ کار بننے والے، دین دشمن اور وطن دشمن عناصر ہیں۔ فرض کیا امریکہ، مغربی ممالک اور نیشنل اور انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ وہی کچھ کر رہے ہیں جس کا اظہار مدیر البرہان نے کیا ہے تو وہ تو دشمن ہیں اور وہی کچھ کریں گے جو ان کے مفاد میں ہوگا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ وطن عزیز کے دینی سیاسی عناصر، ہمارے ملک کی ہیئت اجتماعی اور ہماری قومی سیاسی جماعتیں امریکہ اور مغربی ملکوں کی آلہ کار کیوں بنتی ہیں؟ حد تو یہ ہے کہ نہ صرف مدیر موصوف بلکہ یہ سب نام نہاد مذہبی سیاسی گروہ، so called محب وطن سیاسی جماعتیں

امریکہ اور مغربی قوتوں کو الزام بھی دیتی ہیں اور جانتے بوجھتے ان کا آلہ کار بھی بنتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تحریک انصاف اور جماعت اسلامی کے ساتھ متحدہ دینی محاذ کی ناکامی بھی ذکر کیا ہے۔ موصوف نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ متحدہ دینی محاذ کی اصطلاح ہی متحدہ دینی انتشار کی غمازی کرتی ہے۔ الدین القیم تو ایک ہی ہے اور اس کو ماننے والے ایک ہی گروہ ''امت مسلمہ'' ہیں۔ جب ہم متحدہ دینی محاذ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو شاید ہم مان رہے ہوتے ہیں کہ دین بھی کئی ہیں اور ان کو ماننے والے گروہ بھی متعدد ہیں اس لئے متحدہ دینی محاذ بنانا پڑا۔ یہ متحدہ دینی محاذ بنانے والوں کو نہ اپنے آپ سے شرم آتی ہے نہ اللہ رب العزت سے شرم آتی ہے کہ انہوں نے کس بنیاد پر اللہ کے دین کو کئی ادیان میں تقسیم کر دیا اور اگر ایسا کیا ہے تو اس میں امریکہ، مغربی ممالک اور انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ کا قصور کہاں سے نکل آیا؟ ہمارے خیال میں یہ بھی ہماری حماقتوں میں سے ایک حماقت ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ ہونے کی بجائے انہیں امریکہ اور دیگر قوتوں کے سر منڈھ کر صاف پوتر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور ضمیر کے بوجھ سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدیر البرہان نے عدلیہ کے سیکولر کردار کا بھی ذکر کیا ہے۔ عدلیہ بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہے اور ان میں بھی متحدہ دینی محاذ کے پیروکار ہی برسر کار ہیں۔ ہم ان سے خالص اسلامی مزاج کی توقع کیسے کرسکتے ہیں؟

مدیر البرہان نے بعض 'فکری پہلو' بھی اپنی بحث میں شامل کیے ہیں۔ ذیلی نکات میں پاکستان کی سیکولر سیاست، علماء کا حریفانہ سیاسی کردار، جمہوریت بمعنی مغربیت و بے دینی، عوام قابل اصلاح یا قوت کا سرچشمہ، مغرب کی پلاننگ کا توڑ نہ کرسکنا وغیرہ شامل ہیں۔ ان نکات کے تحت ڈاکٹر محمد امین صاحب نے (معذرت کے ساتھ) کنفیوزڈ اور متضاد آراء کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک طرف وہ فرماتے ہیں کہ غربت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، کرپشن، دہشت گردی جیسے مسائل مشرف، زرداری اور نواز شریف کی نظر میں حقیقی مسائل ہیں اور ''پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے'' یہ اب ہماری سیاست کا مسئلہ نہیں رہا۔ دوسری طرف آگے چل کر ان کا کہنا ہے کہ ''دیکھئے آپ کے قوانین آج بھی اکثر اسلامی ہیں۔ آپ کے دستور میں اسلامی دفعات بکثرت موجود ہیں۔ حدود قوانین موجود ہیں۔ زکوٰۃ، عشر، احترام رمضان، حج، نماز کے لئے قوانین موجود ہیں تو قانونی ڈھانچہ تو آپ کا پہلے ہی بڑی حد تک اسلامی ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ بیان کے ساتھ اگر قرارداد مقاصد کا ذکر بھی ہو جائے تو اس لحاظ سے شریعت اسلامی مکمل نہ سہی بڑی حد تک تو ملکی نظام کا حصہ ہے۔ اگر ایسا ہے اور واقعی ایسا ہی ہے تو سلگتے معاشرتی مسائل یعنی غربت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، کرپشن اور دہشت گردی کیا حقیقی مسائل نہیں ہیں؟ ہم ان مسائل کو کیا سیکولر مسائل کہیں گے؟

ہماری رائے میں تو ان کو حل کرنا عین اسلام اور اسلامی شریعت کا تقاضا ہے۔ مدیر البرہان فقہ اسلامی کے ایک نامور سکالر ہیں۔ انہیں اس ضمن میں شاید کسی دلیل کی ضرورت نہ ہوگی کہ غربت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، کرپشن، دہشت گردی وغیرہ کا حل اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور ان کو ختم کرنا کسی طرح سیکولرازم شمار نہیں ہوسکتا۔

مدیر البرہان نے جمہوریت کی مذمت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض جمہوریت کے ذریعے وہ معاشرے میں ایسی بڑی (اسلامی) تبدیلی اور انقلاب لے آئیں گے جس سے پاکستانی معاشرہ مستحکم ہو جائے گا اور ترقی کرے گا تو ہمارے نزدیک وہ یا تو جاہل، بے عقل اور سادہ لوح ہیں یا عیار، منافق اور دھوکہ باز''۔ مدیر موصوف کی خدمت میں عرض ہے کہ پاکستان میں محض جمہوریت کے ذریعے تبدیلی اور انقلاب کا پرچارک کوئی نہیں۔ معاشرے کی اصلاح کی بات سبھی کرتے ہیں۔ مدیر محترم نے ایک جگہ خود فرمایا ہے کہ جمہوریت تو ایک سیاسی نظام ہے'' جیسے لوگ ہوں گے ویسے ہی وہ حکمران منتخب کریں گے'' تو ظاہر یہ ہوا کہ جمہوریت تبدیلی کا راستہ ضرور ہے مگر اس کے لئے لوگوں کو اسلام کے راستے پر لانا ہوگا تا کہ وہ خود بھی اچھے مسلمان بنیں اور جمہوری طریقے سے اپنے حکمران بھی ایسے منتخب کریں جو اللہ سے ڈرنے والے اچھے مسلمان ہوں اور اس قانونی اور دستوری ڈھانچے پر عمل کریں جو بقول مدیر البرہان پہلے ہی بڑی حد تک اسلامی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو اسلام کے سچے راستے پر کون لائے گا؟ فرد کی تعلیم و تربیت کون کرے گا جس کا مدیر البرہان نے 'فکر و نظر' میں بڑے شد و مد سے ذکر کیا ہے۔ البرہان کے صفحات گواہ ہیں کہ یہ فقیر پہلے بھی اس کا ذکر کرتا رہتا ہے کہ ہماری درماندگی، پس ماندگی اور ذہنی انتشار کی بڑی وجہ 'متحدہ دینی انتشار' ہے جسے مدیر البرہان 'متحدہ دینی محاذ' کا نام دیتے ہیں۔ ان نام نہاد علماء سے کوئی پوچھنے والا ہے کہ حضرات گرامی! آپ نے مسلمانوں کو پہلے سنی شیعہ، پھر سنیوں کو دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور پھر ان کو چار چار پانچ پانچ ٹولیوں میں قرآن و حدیث کی کن تعلیمات کے تحت تقسیم کر رکھا ہے؟ اسی طرح ہمارے شیعہ بھائیوں نے بھی کئی گروہوں کا روپ دھارا ہوا ہے۔ یہ سب حضرات مسلمانوں کو ملت واحدہ کا درس دیتے ہوئے اغراض و مفادات پر مبنی کئی گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے والے اسلام کی طرف نہیں اپنے فرقے کی طرف بلاتے ہیں جو بذات خود ایک سیکولر فعل ہے۔ مجھے اس دریدہ دہنی پر علماء کرام معاف رکھیں جو میں کہنے چلا ہوں کہ ہمارے ملک کے تمام دینی مدارس (الا ماشاء اللہ) سیکولر ہیں۔ وہ ''اسلامی علوم'' پڑھاتے ہیں ''اسلام''

نہیں پڑھاتے۔ قارئین جانتے ہیں کہ مغرب کی کئی نامور یونیورسٹیاں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم دیتی ہیں۔ ہمارے دور کے کئی نامور علما مثلاً ڈاکٹر خالد علوی (مرحوم) نے مغربی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی تو کیا ہم ان یونیورسٹیوں اور ان کے اسلامی علوم کے شعبہ جات کو''اسلامی''تسلیم کریں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ یونیورسٹیاں اسلام نہیں صرف اسلامی علوم پڑھاتی ہیں، ورنہ ان سے پڑھنے والے غیر مسلم اسلامی علوم کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد فوراً مسلمان ہوجاتے۔ یہی حال ہمارے اکثر دینی مدارس کا ہے کہ وہ اپنے فرقے کے مطابق''اسلامی علوم''پڑھا کر دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی اور اہل حدیث بناتے ہیں مسلمان نہیں بناتے۔ اب جب تک سوادِ اعظم کو اسلامی رنگ میں نہیں رنگا جائے گا تب تک جمہوریت کے ذریعے نظام اجتماعی اسلامی رنگ اختیار نہیں کرے گا۔ اسلامی قوانین اور اسلامی دستور موجود رہے گا لیکن نافذ العمل نہیں ہوگا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جس طرح باقی''دین دار طبقے''اپنی غلطیوں اور اپنی غلط پالیسیوں پر نظر نہیں ڈالتے بلکہ امریکہ، مغرب اور اسٹیبلشمنٹ کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے اپنی ہر حماقت سے بری الذمہ ہوجاتے ہیں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے بھی وہی روایتی انداز اپنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اپنی حقیقی اور سوچی سمجھی رائے میری رائے کے قریب ہے لیکن چونکہ وہ ملی مجلس شرعی کے ذریعہ علماء کرام کو یک جہتی کی طرف راغب کرنے کا مثبت کام کرتے رہتے ہیں اس لئے شاید احتیاط کے طور پر انہوں نے کچھ روایتی انداز فکر اپنایا ہے۔ راقم نے اپنی رائے اور تبصرہ کھلے ڈُلّے انداز میں پیش کردیا ہے جو علمی کم اور گدازی زیادہ ہے۔ میرا مقصد کسی طور پر کسی کی توہین کرنا نہیں بلکہ لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی رائے پیش کرنا ہے جس کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی امکان ہے جتنا ٹھیک ہونے کا۔ اس لیے اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو سب سے معذرت۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ پھر جماعت اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی ہیں جو وہ پہلے بھی کئی دفعہ کرچکے ہیں لیکن پلوں کے نیچے سے اتنا پانی گزر چکا ہے کہ جماعت اسلامی کا اب انتخابات کے راستے سے واپس آنا ممکن نہیں۔ یہ شاید ممکن ہوتا اگر بانیٔ جماعت زندہ ہوتے۔ اب تو جماعت کی چوتھی نسل برسرکار ہے۔ اب راستہ تو یہی رہے گا البتہ اس راستے پر چلنے کی حکمت عملی ٹھیک ہونی چاہیے۔ اگر ڈاکٹر محمد امین صاحب کے پاس جماعت کی انتخابی حکمت عملی کے لئے کوئی کارآمد تجاویز ہیں تو ضرور دیں۔

انتخاب 2013ء اور دینی جماعتوں کی ناکامی

پروفیسر طارق بٹ

ناکامی کا تیر بہدف نسخہ
جس پر جماعت اسلامی خلوص سے عمل پیرا ہے

بغیر کسی لمبی چوڑی تحقیق وجستجو کے کئی اہم مضامین انتخابات 2013ء میں جماعت اسلامی کی ناکامی کے حوالے سے ہماری نظر سے گزرے جیسے:

☆ ترجمان القرآن میں سید منور حسن اور ڈاکٹر انیس احمد کے مضامین
☆ بیداری حیدرآباد میں موسیٰ بھٹو صاحب کا تجزیہ
☆ ماہنامہ آفاق میں ملک احمد سرور صاحب اور ایوب حامد صاحب کے مضامین
☆ البرہان میں ڈاکٹر محمد امین صاحب اور پروفیسر طارق بٹ صاحب کا تجزیہ
☆ پندرہ روزہ حدیبیہ کراچی میں ادارتی تبصرہ
☆ معارف فیچر میں ارشد احمد بیگ صاحب کا ''الیکشن، سماج اور اسلامی جدوجہد'' پر مقالہ
☆ ماہنامہ محاذ کشمیر میں عطاء اللہ صاحب کا تجزیہ
☆ مولانا خلیل الرحمن چشتی صاحب کا مضمون

ہمارا ارادہ تھا کہ مزید مضامین تلاش کر کے انہیں انٹرنیٹ پر رکھ دیں گے اور ہر ایک کے موقف کا جامع اور بے لاگ تجزیہ کریں گے تا کہ حقائق نکھر کر سامنے آ جائیں لیکن جماعتی قیادت کا رویہ دیکھ کر ہم نے اس طرح کی کسی کاوش کو بے کار سمجھ کر اس مختصر ''توجہ دلاؤ نوٹس'' کے بعد خاموش رہنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ احتساب اور تنقید وتجزیہ کی کسی کوشش کی حوصلہ افزائی تو رہی ایک طرف، وہ تو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور تاریخ کا سبق یہی ہے، انتظامی سائنس کا قانون یہی ہے اور عقل ومنطق کا تقاضا اور اسلام کا اصول بھی یہی ہے کہ جو بھی فرد، ادارہ، تنظیم، جماعت، تحریک، قوم، ملک اور تہذیب اپنا احتساب نہیں کرتی، اپنی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتی، اپنی ناکامی کا تجزیہ نہیں کرتی، جسے احساس زیاں نہ رہے وہ لوحِ جہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے، مٹ کر رہتی ہے۔

جماعت جو اس شان سے چلی تھی کہ اس کے دستور نے حریت فکر کا علم ہمالیہ کی چوٹی پر یہ کہہ کر گاڑا تھا کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کوئی تنقید سے بالاتر نہیں اور علماء سر پیٹتے رہے کہ صحابہؓ اور اسلاف کے

لئے نرمی برتو لیکن بانی جماعت نے ماضی کے سارے مصلحین ومجددین کے کام میں کیڑے نکالے اور مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں غیر محتاط تبصرے کیے لیکن ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ جماعت کے ارکان، کارکنان اور ہمدردان فکری جبر کے کڑے پہرے میں قید ہیں اور کوئی جماعت کی ٦٦ سالہ جدوجہد کی ناکامی پر جماعت کے کسی پلیٹ فارم سے ایک لفظ کا پبلک تبصرہ نہیں کرسکتا۔

جماعت کو خود چاہیے تھا کہ اپنے جرائد میں بلکہ پبلک میں تنقید وتبصرے اور احتساب کو خوش آمدید کہتی، تلخ وترش سنتی بلکہ ایک کمیشن یا کمیٹی قائم کرتی جو اس طرح کی بحث کو منظم کرتی، دانشوروں کو مدعو کرتی اور عوام، ارکان اور ہمدردان سے حاصل ہونے والے ڈیٹا کی چھان پھٹک کر کے اس کا خلاصہ تیار کرتی اور اسے جماعت کے پالیسی ساز اداروں کے سامنے پیش کرتی جو ان کی روشنی میں اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کرتے یا آئندہ کی پالیسیوں میں اسے پیش نظر رکھتے لیکن جماعت کی قیادت پر مسلط لوگ نظم کے قلعے میں خود کو محصور کر کے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں کہ کوئی رکن، کارکن، ہمدرد اور ووٹر ان پر پبلک میں تنقید نہ کرے، ان کا احتساب نہ کرے اور وہ جو پالیسیاں چاہیں بناتے رہیں۔ حالانکہ جن عوام سے وہ ووٹ مانگتے ہیں، جن ارکان وکارکنان وہمدردگان سے وہ انتخابات میں چندہ، وقت اور صلاحیتیں مانگتے ہیں، ان کا حق ہے کہ یہ انہیں بتائیں کہ یہ کیوں ناکام ہوئے اور ان کا یہ بھی حق ہے کہ وہ ان کی بات، ان کی تجاویز اور ان کے مشورے سنیں لیکن جماعت کی قیادت اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ شوریٰ میں بحث ہو جاتی ہے۔ لیکن شوری میں کیا بحث ہوئی؟ نہ ارکان وکارکنان کو پتہ نہ ہمدردوں اور ووٹروں کو۔

سوال یہ ہے کہ اس فکری جبر کا جواز کیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ نظم وضبط کا تقاضا ہے؟ سوال یہ ہے کہ نظم وضبط کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے جماعت کی بہتری کے لئے۔ تو کیا جماعت کی بہتری اس میں ہے کہ اس کے ارکان وکارکنان وہمدردگان گونگے بن کر رہیں، جماعت کے نفع ونقصان پر بولیں نہیں؟ کاش جماعت کی قیادت سمجھتی کہ ارکان، کارکنان اور ہمدردان کی مایوسی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ان کے کتھارسس اور ان کے نکاسیٔ جذبات کا جماعت کے اندر کوئی انتظام نہیں ان کی کوئی شنوائی نہیں، کوئی راستہ نہیں تو پھر لوگ مایوس نہ ہوں تو کیا ہوں؟

ارکان وکارکنان، عوام اور ووٹرز کو بولنے کا موقع نہ دینا، ان کو قیادت کی کارکردگی کے احتساب کا حق نہ دینا، جماعت کی بہتری کے لئے تجاویز پیش نہ کرنے دینا یہ جماعت کی ناکامی کا ایک بنیادی سبب ہے جس پر جماعت اسلامی کی قیادت بڑے اخلاص سے عمل پیرا ہے۔ لہٰذا جماعت کی ناکامی اور اس کی

اصلاح نہ ہونے دینے کی ذمہ دار اس کی قیادت ہے اور جب باڑ ہی کھیت کو کھانے لگے تو فصل کیسے بچ سکتی ہے اور کیسے پنپ سکتی ہے؟ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

> مغرب سے مرعوب ومتاثر مسلم دانشور مغربی فکر وتہذیب کی حمایت اور اسے مسلمانوں کے لیے قابل قبول قرار دینے کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو مارچ ۲۰۱۲ء کے 'الرسالہ' سے ہم یہاں دے رہے ہیں۔
>
> ہم البرہان کے فاضل قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی مولانا کے دلائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں عقلی استدلال کے ساتھ رد کرے تو ہم اسے البرہان میں خوشی سے جگہ دیں گے۔ مدیر

اسلام اور مغرب مولانا وحید الدین خاں

فکرِ مغرب

فکرِ مغرب (Western thought) کیا ہے؟ فکرِ مغرب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، سائنسی طرز فکر (scientific thinking) کا نام ہے اور سائنسی طرزِ فکر پورے معنوں میں ایک درست طرز فکر ہے۔ وہ بجائے خود اسلامی فکر نہیں ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک موافقِ اسلام طرز فکر ہے۔ وہ اسلام کے حق میں ایک مؤید علم (supporting knowledge) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل مغربی فکر نہ غیر اسلامی فکر ہے اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے، اسلام دشمن فکر ہے۔

قرآن کی سورۃ الاحقاف میں یہ آیت آئی ہے:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِ□ نْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ [4:46]

''یعنی کہو کہ کیا تم نے غور کیا اُن چیزوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے زمین میں کیا بنایا ہے، یا آسمانوں میں ان کی کچھ شرکت ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ، یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔''

مفسر ابن کثیر (وفات: ۷۷۴ ہجری) نے درست طور پر لکھا ہے کہ قرآن کی اِس آیت میں دو قسم کے علم کو بطور مستند علم (authentic knowledge) تسلیم کیا گیا ہے — ایک علمِ نقلی اور دوسرا علمِ عقلی۔ علمِ نقلی سے مراد مبنی بر وحی علم ہے اور علم عقلی سے مراد وہ علم ہے جو عقلِ انسانی پر مبنی ہو۔ تاہم علمِ عقلی سے مراد صرف وہ علم نہیں ہے جو عباسی دور کے معتزلہ اور متکلمین کے درمیان پایا جاتا تھا، بلکہ توسیعی طور پر اُس سے

مرادسائنسی دورکاوہ جدیدعلم بھی ہےجس کوعقلی علم(rational knowledge) کہاجاتاہے۔

اِس جدید عقلی دورکا آغاز اٹلی کے سائنس دان گلیلیو (Galieo Galilei) سے ہوا۔ گلیلیو کی وفات ۷۸ سال کی عمر میں ۱۶۴۲ء میں ہوئی۔ گلیلیو پہلا شخص ہےجس نے دوربین(teleschope) کا استعمال کیا۔ گلیلیو کوجدیدسائنس کا بانی(founder of modern science) کہاجاتاہے۔

گلیلیو سے پہلے دنیامیں زمین مرکزی نظریہ(geo-centric theory) کو ماناجاتاتھا،جس کو ٹالمی(Claudius Ptolemy)اورارسطو(Aristotle) کی حمایت حاصل تھی۔ گلیلیو نے ثابت کیا کہ زمین کامرکزی نظریہ غلط ہےاوراِس کے مقابلے میں وہ نظریہ درست ہےجس کوآفتاب مرکزی نظریہ (heleo-centric theory) کہاجاتاہے۔

اس کے بعدتاریخ میں ایک نیاعقلی دوریاسائنسی دورشروع ہوا۔ اِس دورمیں عقلی ثبوت کا یہ معیار قرارپایا کہ قابل اعتمادعلم صرف وہ ہے جوقابل تصدیق علم (verifiable knowledge) ہو۔ دوربینی مشاہدہ نے زمین مرکزی نظریہ کی تصدیق کردی،اِس لیے وہ عقلی طورپردرست قرارپایا۔

سائنس دراصل اسی قابل تصدیق علم(verifiable knowldge) کااصطلاحی نام ہے۔اہل سائنس نےعلمِ وحی(revealed knowledge) کاانکارنہیں کیا،البتہ انہوں نےعلم وحی کواپنے دائرہ تحقیق سے باہرقراردیا،کیونکہ وہ ان کےنزدیک قابل تصدیق نہ تھا۔

اِس کے بعدعلم کی دنیامیں ایک تقسیم(bifurcation) کا طریقہ وجودمیں آگیا۔اب علم وحی کا دائرہ الگ ہوگیااورعقلی علم یاسائنسی علم کا دائرہ الگ۔ یہ تقسیم بجائےخودغلط نہ تھی۔اِس کی بناپراہلِ سائنس کو یہ موقع ملاکہ وہ آزادانہ طورپراپنی تحقیق کوجاری رکھ سکیں۔اِس طرح سائنس کی تحقیق کا دائرہ اُس دنیا سے ہوگیا جس کوفطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ اِسی لیے سائنس کو دوسرے الفاظ میں فطری علم (natural science)یامادّی علم (physical science) کہاجاتاہے۔

تائیدی علم

سائنسی علم براہ راست طورپراسلامی علم نہ تھا،لیکن بالواسطہ طورپروہ اسلام کے لیےایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتا تھا۔عقل کی صلاحیت کولے کرسائنسی دنیامیں جوتحقیقات ہوئیں،اُس سے اسلام کوبہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔اِس اعتبار سے سائنس کاپوراعلم،اسلام کے لیے تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جدیدسائنس اُس حدیث رسول کی مصداق ہے جوپیشین گوئی کی زبان میں اِن

الفاظ میں آئی ہے:

ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۰۶۲)

فطرت میں سائنسی تحقیق کے ذریعے جو دریافتیں وجود میں آئیں، وہ خاص طور پر دو اعتبار سے اسلام کے لیے غیر معمولی تائید کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک قسم کی تائید وہ تھی جو اُس سائنس کے ذریعے حاصل ہوئی جس کو نظریاتی سائنس (theoratical science) کہا جاتا ہے اور اسلام کے لیے دوسری تائید وہ تھی جس کو اصطلاحی طور پر انطباقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔

نظریاتی سائنس نے یہ کیا کہ اس نے فطرت (nature) میں چھپے ہوئے وہ قوانین دریافت کیے جو اب تک غیر معلوم تھے۔ اِن قوانین کے بارے میں اشارات قرآن میں موجود تھے، لیکن قرآن میں ان کی تفصیل موجود نہ تھی۔ اہل ایمان کو ابھارا گیا کہ وہ زمین و آسمان میں غور کر کے اِن تفصیلات کو دریافت کریں، جو کہ ان کے لیے اضافہ ایمان کا ذریعہ ہیں۔ لیکن بعد کے زمانے کے مسلمان یہ کام نہ کر سکے۔ آخر کار، اللہ تعالیٰ نے اہل سائنس کے ذریعے یہ کام لیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہی منصوبہ ہے جس کو قرآن میں مستقبل کی پیش گوئی کے طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ [41:53]

اس معاملے کی ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا [50:9]

''یعنی ہم نے آسمان سے مبارک پانی اتارا۔''

قرآن کی اِس آیت میں اُس آفاقی تطہیر کا ذکر ہے جس کو موجودہ زمانے میں ازالہ نمک (desalination) کہا جاتا ہے۔ پانی کا ذخیرہ جو سمندروں میں جمع ہے، اُس میں تحفظاتی مادہ (preservative) کے طور پر تین فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ یہ نمکین پانی انسان کے لیے ناقابل استعمال ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کے مطابق، ایک عظیم آفاقی عمل ہوتا ہے جس کے ذریعے سمندر کا پانی نمک سے الگ ہو کر اوپر فضا میں جاتا ہے اور پھر بارش کی صورت میں خالص پانی زمین کی طرف لوٹتا ہے جس کو انسان اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں، مبارک کے لفظ کی صورت میں اُس کا اشارہ موجود تھا، لیکن اس کی تفصیل ہزار سال بعد جدید سائنس نے معلوم کی، وغیرہ۔

انطباقی سائنس (applied science) کے ذریعے اسلام کو بہت سے تائیدی ذرائع حاصل

ہوئے۔مثلاً پرنٹنگ پریس اور کمیونیکیشن۔ان جدید سائنسی دریافتوں کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت کا کام عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔اللہ تعالیٰ کو اوّل دن سے یہ مطلوب تھا کہ دینِ حق کو دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے،لیکن جدید ذرائع کے وجود میں آنے سے پہلے اِس کا امکان ہی نہ تھا۔تاریخ میں پہلی بار یہ امکان جدید انطباقی سائنس کے ذریعے پیدا ہوا۔

عالمی دعوت کا امکان:

حدیث میں اسلامی دعوت کے ایک امکان کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر و لا وبر الا أدخله الله کلمة الاسلام (مسند احمد، رقم الحدیث ۲۴۲۱۵)

''زمین کی سطح پر کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔''

اس حدیث رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی میں جب کہ اسلام کا ظہور ہوا، اُس وقت سے یہ اسلامی دعوت کا نشانہ تھا کہ اسلام کا کلمہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مردوں اور عورتوں تک پہنچ جائے۔مگر ایک ہزار سال تک یہ نشانہ عملاً پورا نہ ہو سکا، کیوں کہ اسباب کی اِس دنیا میں اِس نشانے کو پورا کرنے کے لیے عالمی ذرائع درکار تھے، جو کہ پچھلے ادوار میں موجود نہ تھے۔دورِ جدید میں سائنس نے پہلی بار یہ موافق ذرائع فراہم کیے۔اِس اعتبار سے دیکھئے تو مذکورہ حدیث کی تشریح ان الفاظ میں کرنا درست ہو گا کہ ــــ بعد کے زمانے میں ایسا ہو گا کہ اللہ کی توفیق سے ایسے اسباب وجود میں آئیں گے جن کو استعمال کر کے یہ ممکن ہو جائے گا کہ اہلِ ایمان اسلام کے کلمہ کو دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔

منفی رائے کا سبب

مغرب اور فکرِ مغرب کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان منفی رائے پائی جاتی ہے۔عام طور پر مسلمان مغرب اور فکرِ مغرب کو اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں۔اِسی بنا پر موجودہ زمانے کے تمام مسلمان اہلِ مغرب سے نفرت کرتے ہیں اور مغربی علم سیکھنے کو ایک ناپسندیدہ فعل قرار دیتے ہیں۔مگر مسلمانوں کی یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر متعصّبانہ فکر (biased thinking) کا نتیجہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں مغربی علم وجود میں آیا، اُسی زمانے میں ایک اور واقعہ وجود میں آیا جس کو مغربی استعمار (western colonisation) کہا جاتا ہے۔اِسی زمانے میں مغربی قوموں،

خاص طور پر برطانیہ اور فرانس نے ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اپنا سیاسی غلبہ قائم کرلیا۔ یہ ممالک اُس وقت مسلم سلطنت کا حصہ تھے۔ اِس سیاسی واقعے نے مسلمانوں کے اندر اہل مغرب کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی۔ اِس کے بعد جب ۱۹۴۸ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کی تقسیم کی اور پھر امریکا، عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کا حامی بن گیا تو اِس کے نتیجے میں اہل مغرب کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ یہ نفرت ابتداءً قومی سطح پر ہوئی اور پھر اِس کے بعد مسلمان ہر اُس چیز سے نفرت کرنے لگے جو مغرب کی طرف سے آئی ہو۔

دو چیزوں میں فرق نہ کرنا

کہا جاتا ہے کہ نفرت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ یہی واقعہ مغرب کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ نفرت کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو متعصّبانہ ذہن پیدا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو چیزوں میں فرق نہ کر سکے ــــ مغربی علم اور اہل مغرب کی عملی کمزوریاں۔ یہ کمزوریاں ہر قوم میں لازماً پیدا ہوتی ہیں، حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں بھی۔

اہل مغرب کی جدید تاریخ کا ایک حصہ وہ تھا جو سائنسی علم یا عقلی علم (rational knowledge) سے تعلق رکھتا تھا، کیونکہ اسلام خود پورے معنوں میں ایک عقلی مذہب (rational religion) ہے۔ جدید سائنسی علم کا یہ حصہ پوری طرح اسلام کے موافق تھا۔ اِسی کے ساتھ بشری کمزوری کی بنا پر دو اور ظاہرے وجود میں آئے جو عام طور پر ہر قوم میں وجود میں آتے ہیں ــــ ایک حقیقتوں کی غلط توجیہہ (misinterpretation) اور دوسرے آزادی کا غلط استعمال (misuse of freedom)۔ یہ دونوں چیزیں بلا شبہ قابل اعتراض تھیں مگر وہ اہل مغرب کی انسانی کمزوریاں تھیں، وہ خود مغربی سائنس کا حصہ نہ تھیں۔ مگر مسلمان اپنے تعصب کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکے، وہ غلط توجیہہ یا آزادی کے غلط استعمال کی طرح خود مغربی سائنس کو بھی منفی نظر سے دیکھنے لگے۔

مثال کے طور پر مغربی دنیا میں برہنگی (nudity) کا کلچر ہے۔ یہ بات بطور واقعہ درست ہے، مگر اس کا تعلق فکر مغرب سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق آزادی کے غلط استعمال سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امتحان کی مصلحت کی بنا پر انسان کو آزادی دی ہے۔ انسان کو خود اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے یا چاہے تو وہ اس کا درست استعمال کرے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا رہا ہے، اِسی طرح موجودہ زمانے میں بھی۔ البتہ

موجودہ زمانے میں ڈگری کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اِسی طرح مغربی دنیا میں شراب کا رواج بھی آزادی کے غلط استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ خود فکر مغرب سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں وغیرہ۔

اس سلسلے میں دوسرا معاملہ غلط توجیہہ (misinterpretation) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں مغربی دنیا میں کئی نظریات وجود میں آئے مثلاً ڈارون ازم (Darwinism)، فرائڈ ازم (Freudism) اور مارکس ازم (Marxism) وغیرہ۔ یہ نظریات بلا شبہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف تھے، مگر یہ نظریات فکر مغرب کا براہ راست حصہ نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کی غلط توجیہہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہم کو یقینا دلائل کی بنیاد پر اِن نظریات کی تردید کرنا چاہیے، مگر یہ درست نہیں کہ ہم اِن نظریات کے حوالے سے خود فکر مغرب کو غلط سمجھنے لگیں۔

اس قسم کی برائی ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ خود مسلم معاشرے میں بھی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں جن لوگوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو شہید کیا، ان کا کیس یہی تھا کہ انہوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں آزاد مسلم ملکوں میں خود مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے، خود اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔

یہی معاملہ غلط توجیہہ کا ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خوارج کا جو ظاہرہ پیدا ہوا، وہ اسلام کی غلط توجیہہ کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں اسلام کی سیاسی تعبیر بھی قرآن وحدیث کی غلط توجیہہ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

عصری ذہن

عام طور پر مسلمان عصری ذہن کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ اس کا سبب وہی ہے جس کو **الناس أعداء ماجهلوا** کہا جاتا ہے، یعنی بے خبری کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لینا۔ عصری ذہن کے بارے میں عادلانہ رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت پسندانہ ذہن کے تحت تجزیہ کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے عصری ذہن کا کیس کیا ہے۔

عصری ذہن کی اصل مغربی ذہن ہے۔ مغربی ذہن یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد پیدا ہونے والے ذہن کا نام ہے۔ اُس دور میں کچھ ایسے افراد یورپ میں اٹھے جنہوں نے فطرت (nature) کا مطالعہ غیر روایتی انداز میں شروع کیا۔ اِس سلسلے میں پہلا نمایاں نام اٹلی کے

سائنس داں گلیلیو (وفات: ۱۶۴۲ء) کا ہے۔ گلیلیو تاریخ کا پہلا شخص ہے جس نے فلکیات کے مطالعے میں دوربین (telescope) کا استعمال کیا۔ یہ ۱۶۰۹ء کا واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں روایتی تصور یہ تھا کہ زمین مرکز میں ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ گلیلیو نے اپنے دوربینی مشاہدے میں جن حقیقتوں کو دریافت کیا، اُن سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ سورج مرکز میں ہے اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں عام طور پر روایتی طرز کا فکر کا غلبہ تھا۔ اُس وقت گلیلیو کا یہ اعلان ایک دھماکہ خیز واقعہ ثابت ہوا۔ اُس وقت مسیحی چرچ یورپ میں روایتی طرز فکر کا نمائندہ تھا۔ مسیحی پوپ کو یورپ کا بے تاج بادشاہ (uncrowned king) سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مسیحی چرچ اور سائنس دانوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں سائنس دانوں کو فتح ہوئی۔

مسیحی چرچ کے اختیار کا دائرہ دن بدن سمٹنے لگا، یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں حکومتِ اٹلی اور مسیحی پوپ کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو لیٹران معاہدہ (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے مطابق مسیحی چرچ اس پر راضی ہو گیا کہ اس کا دائرہ اختیار روم کے ایک مختصر علاقہ ویٹکن (Vatican) تک محدود رہے گا جس کا کل رقبہ صرف ۱۰۹ ایکڑ ہے۔

اِس طرح تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ اگر اس واقعے کو مذہبی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو اِس دور کو ایمان بالغیب کے بجائے ایمان بالشہود کا دور کہا جائے گا۔ اِس دور میں فطرت کا مطالعہ مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کے اندر چھپے ہوئے بے شمار رموز دریافت ہوئے جو اب تک انسان کے لیے غیر دریافت شدہ بنے ہوئے تھے۔ اِس کے نتیجے میں نئی ٹیکنالوجی، نئی صنعتیں، نئے ذرائع و وسائل انسان کی دسترس میں آ گئے۔

یہ نئی مسحور کن دنیا تمام تر آبجیکٹیو مطالعہ (objective study) کے ذریعے انسان کی دسترس میں آئی تھی۔ اِس میں مبنی بر وحی مطالعہ کا بظاہر کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ دور بظاہر سائنس دانوں کی تحقیقات کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس دور کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ قابل پیمائش (measurable) کو ناقابل پیمائش (non-measurable) سے الگ کر دیا گیا۔ اِس کے نتیجے میں علمی دنیا میں فکر کا وہ طریقہ رائج ہوا جس کو موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کہا جاتا ہے۔ اِس طریقے کی عملی کامیابی کی بنا پر اس کو موجودہ دور میں رواجِ عام حاصل ہو گیا۔

سائنس دانوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کا طریق مطالعہ تمام حقائق کو جاننے کے لیے واحد

کارآمد طریقہ ہے۔ اِس کے برعکس انہوں نے کھلے طور پر یہ تسلیم کیا کہ سائنس پورے علم حقیقت کا احاطہ نہیں کرتی، وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

سائنسی طریقِ مطالعہ اپنی عملی کامیابی، نہ کہ نظری صداقت کی بنا پر موجودہ زمانے میں بہت زیادہ عام ہوگیا، حتیٰ کہ فلاسفہ اور مفکرین نے بھی اِسی طرز فکر کو اختیار کرلیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جس طرح فطرت (nature) کا مطالعہ موضوعی انداز میں کرتے تھے، اسی طرح وہ مذہب کا مطالعہ بھی موضوعی انداز میں کرنے لگے۔ وہ مذہب کو الہامی ظاہرہ (revealed phenomenon) تسلیم کرنے کی بجائے، اِس کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) سمجھنے لگے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق پیغمبر اور پیغمبر کے کام کا اُسی طرح تجزیہ کرنے لگے جس طرح وہ مادی چیزوں کا تجزیہ کررہے تھے۔

جدید مفکرین کا یہ طریقہ از روئے حقیقت درست نہ تھا لیکن اس کا سبب عناد یا سازش نہ تھی، بلکہ وہ اُن کے اختیار کردہ طریقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ طریقہ مذہب کے خلاف تھا، مگر وہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ بطور خود اِس کو درست طریقِ مطالعہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ یہ طریقہ مذہب کے خلاف تھا، مگر وہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ بطور خود اِسی کو درست طریقِ مطالعہ سمجھتے تھے۔ سنجیدگی کے ساتھ ان کا یہ یقین تھا کہ یہ طریقہ جس طرح مظاہر فطرت کے مطالعے میں کامیاب ثابت ہوا ہے، اِسی طرح وہ وحی والہام کے مظاہر کے مطالعے میں بھی کامیاب ہوسکتا ہے۔

سائنس دانوں نے جو کام کیا، وہ تائید (support) کے اعتبار سے، اہل اسلام کے لیے انتہائی مفید تھا، لیکن مسلم ذہن اپنی منفی سوچ کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکا۔ انہوں نے نئے دور میں پیدا ہونے والی مغربی تہذیب کو کلی طور پر اسلام دشمنی کا کیس قرار دے دیا۔ حالانکہ اگر وہ اِس معاملے میں غیر جانب دارانہ انداز میں اہل مغرب کے کیس کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ اہل مغرب کا کام، خود پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق، باعتبار نتیجہ تائید دین کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے تخریب دین کا معاملہ نہ تھا۔

حرفِ آخر

موجودہ زمانے میں اہل مغرب کا کنٹری بیوشن (contribution) بہت زیادہ ہے، سیکولر اعتبار سے بھی اور اسلامی اعتبار سے بھی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اہل مغرب کی کوششوں سے ایک نئی دنیا وجود میں

آئی ہے، جس کو جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔ جدید تہذیب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، منصوبہ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ فطرت میں چھپے ہوئے قوانین دریافت کئے جائیں۔ فطرت کے تخلیقی امکانات کو انفولڈ (unfold) کیا جائے۔ مادی دنیا میں چھپے ہوئے آلاء اللہ (wonders of God) کو علمِ انسانی کا حصہ بنایا جائے، تاکہ اللہ کا دین روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور تک پہنچے، تاکہ اللہ کی معرفت کے اعلیٰ پہلو انسان پر کھلیں، تاکہ قرآن کے مخفی 'عجائب' معلوم واقعہ بن جائیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھا اور مغربی تہذیب کے ذریعے اسی مطلوبِ الٰہی کی تکمیل ہوئی ہے۔

اس دنیا میں مثبت پہلو (positive aspects) کے ساتھ ہمیشہ کچھ منفی پہلو (negative aspects) شامل رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تاریخ کی مثبت تعبیر تلاش کی جائے۔ مثال کے طور پر اسلام کے عہد اول میں اہل ایمان کی پہلی جنریشن کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی، جو کہ بلا شبہ ایک منفی واقعہ تھا، مگر اِس منفی واقعے کے باوجود اسلام کے مثبت انقلابی رول کا اعتراف کیا جائے گا۔ اِسی طرح اہل مغرب کے ترقیاتی کارناموں کے ساتھ اگر کچھ منفی پہلو شامل ہیں تو اِس بنا پر ہرگز ایسا کرنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان اہل مغرب کے بارے میں منفی ذہن کا شکار ہو جائیں اور وہ اہل مغرب کے مثبت کارناموں کا اعتراف نہ کریں۔

اِس قسم کا منفی رویہ خود مسلمانوں کی اپنی ذات کے لیے شدید نقصان کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اِس قسم کا منفی رویہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا ہے اور حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا بلاشبہ دنیا کے پہلو سے بھی ہلاکت خیز ہے اور آخرت کے پہلو سے بھی۔

اسلام اور مغرب

عبدالقادر سیف

اسلام اور کنزیومرازم

[البرہان کا مستقل موقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے وہ ابلیسی اور اسلام مخالف ہیں۔مغرب کی بھرپور خواہش ہے کہ ساری دنیا عموماً اور مسلم دنیا خصوصاً ان کی اس عالمگیر تہذیب کو قبول کرلے، اس کی زلفوں کی اسیر ہو جائے۔'گلوبلائزیشن' کی تحریک کا بنیادی مقصد یہی ہے۔سیاست میں جمہوریت اور معیشت میں نظام سرمایہ داری کا فروغ اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں اور مغرب اپنی سیاسی اور حربی برتری اور میڈیا کی قوت کے ذریعے اپنے مقاصد میں ابھی تک کامیاب ہے اور اس نے جمہوریت کو ایسا تقدس عطا کر دیا ہے کہ اس کی مخالفت کر کے کوئی نکّو، دہشت گرد اور بنیاد پرست کہلوانا نہیں چاہتا اور مغرب دوسری قوموں میں جمہوریت کے فروغ کے لیے علی الاعلان کروڑوں ڈالر سالانہ مختص کرتا ہے۔یہی حال اس کے نظام سرمایہ داری کا ہے کہ اس نے اسے عالمی معاشی نظام کے طور پر واحد قابل عمل حل ثابت کر دیا ہے اور کل کے کمیونزم وسوشلزم کے علمبردار، روس اور چین بھی اس پر عمل پیرا ہیں اور بلاسود نظام کے علمبردار مسلم ممالک بھی اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں اور اسلام کا معاشی نظام کتابوں میں مدفون ہے۔مغرب کے اس مکروہ نظام سرمایہ داری کے ایک پہلو کنزیومرازم پر عبدالقادر سیف صاحب نے اس مختصر مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔مدیر]

اگر آسان الفاظ میں کنزیومرازم یا ''صارفیت'' کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ صارف کو زیادہ سے زیادہ چیزوں کی طرف راغب کرنے کا نام ہے یا یہ کہ ''صارفیت'' ایک نظریہ ہے جس کے مدعیوں کا یہ کہنا ہے کہ معاشی ترقی کے لئے اشیائے صرف کی بھرمار لازمی اور بے حد ضروری ہے۔اس نظریے کی بنیاد چونکہ اشیائے صرف اور اشیائے تعیش کے اضافے پر ہے جو کہ عموماً بغیر مال و دولت کی ریل پیل کے ممکن نہیں، اس لئے اس کا خلاصہ یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ''زیادہ دولت زیادہ خوشیاں''۔

اس نظریے کو یورپ کے صنعتی انقلاب کی بدولت بھرپور ترقی ملی ہے، وہ صنعتی انقلاب جس کے نتیجے میں ہر طرف مصنوعات ہی مصنوعات سجی ہوئی ہیں، کہیں مصنوعات کی تشہیر، کہیں ان کی تیاری، کہیں ان کی تقسیم تو کہیں ان میں مقابلہ و مسابقت۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مقصد زیادہ

سے زیادہ مصنوعات تک رسائی ہے اور زندگی کا تمام تر چین وسکون مصنوعات کی کثرت میں پنہاں ہے۔ شاپنگ مالز، ڈیپارٹمنٹل اسٹورز، سپر مارکیٹس اور شورومز مصنوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں موجود مصنوعات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو بمشکل دس پندرہ فیصد ہی ایسی نکلیں گی جو ایک انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہوں، بقیہ کا تعلق پر تعیش اشیاء اور لگژریز سے ہوگا۔ مہنگے ترین لباس، میک اپ کا سامان، عمارتوں کی آرائش ونمائش کی مصنوعات، گراں قیمت کاریں، ان میں سے کچھ بھی تو انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل نہیں۔ اسی طرح مہنگے ترین کھانوں کے مراکز میکڈونلڈ، کے ایف سی اور پیزا ہٹ وغیرہ ہیں۔

غرض ایک سے بڑھ کر ایک مہنگی شے کثیر مقدار میں دستیاب ہے اور ان کو حاصل کرنے کی فکر میں بنیادی ضروریات تک کو ثانوی حیثیت دی جانے لگی ہے۔ ان آسائشات کے لئے قرض لیے جانے لگے ہیں اور انہیں اتارنے کے لئے بے پناہ کام اور محنت کرنے کے نتیجے میں معاشرتی تعلقات میں بگاڑ کے علاوہ ملی خدمات کا ذوق وشوق ماند پڑتا جا رہا ہے۔ لوگ فیشن بدلنے پر پرانی چیزوں کو ضائع کر کے نئی چیزیں خریدنے کے عادی بنتے جا رہے ہیں اور اکثر یہ چیزیں انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہی نہیں ہوتیں، اشیاء کی طلب میں اضافے نے ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ کر دیا ہی

پر تعیش مصنوعات کی باسہولت دستیابی بذات خود ان کی بڑی تشہیر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی باقاعدہ تشہیر کے لئے کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور صارف کو ان اشیاء کی طرف راغب کرنے کے لئے تشہیری مہم میں عموماً انتہائی مالدار طبقے کے انداز زندگی کو دکھلایا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ غریب، امیر بننے اور امیر اور زیادہ امیر بننے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ صارفیت کے شکار لوگ اپنے پیٹ اور اپنے سٹیٹس میں ایسے مگن ہوتے ہیں کہ انہیں قریب رہنے والے مسلمان کی بھوک و پیاس تک کی فکر نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا سطور میں صارفیت کے جو اوصاف ونتائج ذکر کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ یہ سراسر ایک فتنہ ہے اور اس سے متاثر مسلمان اپنے دین کی بنیادی تعلیمات سے دور ہے۔ صارفیت کی بنیاد زیادہ سے زیادہ پر تعیش اشیاء کے حصول پر ہے جب کہ دین اسلام بقدر ضرورت اشیاء پر اکتفا کی تعلیم دیتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی روشنی میں جس شخص کی صبح

اس حالت میں ہو کہ اسے امن میسر ہو، جسم ٹھیک ٹھاک ہو اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا موجود ہو تو گویا اس کو دنیا اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ حاصل ہے۔

صارفیت زیادہ سے زیادہ مصنوعات کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے پر ابھارتی ہے جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نزدیک اس امت کے لئے مال سب سے بڑا فتنہ ہے۔

صارفیت غریب کو امیر کی نقالی کی دعوت دیتی ہے اور اسے بڑا عہدہ اور بڑے عہدے والے کے اطوار و انداز اختیار کرواتی ہے جب کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق جس طرح دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کو برباد کر دیتے ہیں اسی طرح حب مال اور حب جاہ ایمان کو برباد کر دیتے ہیں اور مال و دولت میں مقابلے کی مذمت کو قرآن کریم کی ایک پوری سورت میں بیان کیا گیا ہے جس کا نام سورۃ التکاثر ہے۔

صارفیت انسان کو خودغرض بناتی ہے جب کہ اسلام ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو دوسروں کی فکر کرتے ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں اور جن کے مال میں قرآن کریم کے مطابق مانگنے والوں کے لئے بھی حصہ ہوتا ہے اور نہ مانگنے والوں کے لئے بھی حصہ ہوتا ہے۔

صارفیت کا دلدادہ نت نئے ملبوسات اور بےضرورت اشیاء کی فکر میں لگا رہتا ہے جب کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق دنیا میں ایک مسافر کی سی زندگی گزارنی چاہیے۔ اسلام نے بلاضرورت یا ضرورت سے زائد خرچ کرنے والوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا ہے۔ صارفیت انسان کو حد سے زیادہ فضول خرچ بناتی ہے جب کہ قرآن کریم میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔

اسی طرح صارفیت نے ایک مسلمان کو آسائشات کا ایسا خوگر اور عادی بنا دیا ہے کہ اب وہ کسی ادنیٰ تکلیف کے لئے بھی تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاد جو کہ اسلام کی چوٹی اور اس کی شان ہے وہ اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے کیونکہ جہاد میں بھی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لئے ایک تن آسانیاں ڈھونڈنے والا شخص کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بحیثیت امت مسلمہ مغربی تہذیب، نظام سرمایہ داری اور کنزیومرازم کے فتنے کو سمجھیں اور اس سے بچاؤ کے لئے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت حاصل کریں اور ان پر عمل کریں (بشکریہ ''شریعت'')۔

تزکیۂ نفس

ڈاکٹر محمد امین

روزۂ بے ثمر

الحمدللہ کہ ہمارے معاشرے میں رمضان میں کچھ تبدیلی آتی ہے۔ بہت سے لوگ روزہ رکھتے ہیں، بھوک پیاس برداشت کرتے ہیں، مسجدیں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں، لوگ قیام اللیل یعنی بعد نماز عشاء تراویح بھی ادا کرتے ہیں اور یہ سب تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔ بہت سے لوگ آخر رمضان میں فطرانہ بھی دیتے ہیں جس سے غریبوں کی کچھ مدد ہو جاتی ہے اور پھر عید کے روز شکرانے کی دو رکعت بھی ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان نصیب فرمایا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے روزے بے ثمر نہیں ہوتے اور کچھ نہ کچھ بہتری فرد اور معاشرے میں آتی ہے......لیکن، اور یہ لیکن بھی بہت اہم ہے، کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ روزے سے وہ سارے اثرات ہم پر کیوں مرتب نہیں ہوتے جو شریعت چاہتی ہے؟

اوّل تو ہمارے معاشرے میں اب ان لوگوں کی تعداد بدقسمتی سے دن بدن بڑھ رہی ہے جو روزہ نہیں رکھتے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق روزہ نہ رکھنے والوں کی تعداد 35 سے 45 فیصد ہے۔ عام حالات میں ہمارے ہاں نماز پڑھنے والوں کی شرح پانچ سات فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ رمضان میں یہ اندازاً تین چار گنا بڑھ جاتی ہے اور لگ بھگ 33 فیصد ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے دو تہائی افراد اب بھی نماز نہیں پڑھتے۔ اس میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے کیونکہ ان کے مسجدوں میں جانے کا رجحان، انتظام اور تحریک موجود ہی نہیں۔ اور جو لوگ تراویح میں قرآن حکیم سننے جاتے ہیں یا گھر میں قرآن حکیم رمضان میں ختم کرتے یعنی پورا پڑھتے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت (اندازاً 90 سے 95 فی صد) قرآن حکیم کے مفہوم کو نہیں سمجھتی کیونکہ وہ عربی سے نابلد ہوتی ہے اور معاشرے میں قرآنی عربی کے سمجھنے سمجھانے کے مواقع نہایت قلیل اور غیر موثر ہیں۔ پھر تراویح عموماً جس رفتار سے پڑھائی جاتی ہیں اس میں قرآن حکیم میں تفکر و تدبر کر سکنے کا پہلو پایا ہی نہیں جاتا، الا ماشاءاللہ۔

پھر روزے سے حقیقی استفادے میں کچھ دیگر موانع بھی ہیں۔ بہت سے لوگ روزے کا مطلب ترک اکل و خورد ہی سمجھتے ہیں اور اسی تک محدود رہتے ہیں یعنی ساتھ جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ،

جھگڑے، دفتر میں کام نہ کرنا، تجارت میں بے ایمانی کرنا، فحش فلمیں، ڈرامے اور دیگر پروگرام دیکھنا، افطاری میں چٹخارے دار اور مرغن کھانوں کی کثرت ...... یہ سب بھی ساتھ چلتا رہتا ہے تو پھر روزے سے وہ تقویٰ کیسے پیدا ہو جو شریعت کو دراصل مطلوب ہے۔ وہ صبر کیسے پیدا ہو جو اللہ کے اوامر پر عمل کرنے میں درکار مشقت کے لئے مطلوب ہے۔ وہ للّٰہیت کیسے پیدا ہو جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنے اور وہ بھی ایسی جو زندگی کے اطوار بدل دے بلکہ اس میں انقلاب لے آئے کیونکہ یہ دوئی اور سیکولرزم اسلام میں کب ہے کہ ہماری دنیا ہمارے دین سے متاثر نہ ہو بلکہ اسلام میں فرد میں للّٰہیت پیدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ نہ صرف اس کی انفرادی زندگی بدل جائے اور احکام الٰہی کی تابع ہو جائے بلکہ اجتماعی زندگی بھی اسلامی احکام کے مطابق ڈھل جائے۔ اس کا مطلب ہی یہ ہونا چاہیے کہ جب ایمان دل میں گھر کر جائے تو یہ تزکیہ نفس کا سبب بنے، یہ مسلمان کی قوت و ہیبت میں اضافے کا سبب بنے اور اس سے کفر پر لرزہ طاری ہو جائے ...... کاش اللہ ہمیں ایسا رمضان اور ایسے روزے نصیب فرمائے، باثمر اور موثر۔

ملی مجلس شرعی

دینی مسالک میں تقارب اور رواداری کا فروغ

ملی مجلس شرعی کے علماء کرام کا ۱۸ نکاتی متفقہ اعلامیہ

ملی مجلس شرعی کے اجلاس مؤرخہ ۸ جولائی ۲۰۱۳ء میں سارے مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام نے دینی مسالک اور جماعتوں میں تقارب اور رواداری کے فروغ کے لیے مندرجہ ذیل ۱۸ نکات کی متفقہ طور پر منظوری دی:

شدت اختلاف میں کمی

۱۔ دینی جرائد اور مجالس میں ایسی جذباتی تقریروں، تحریروں، مناظروں اور مباحثوں سے اجتناب کیا جائے جن کا مقصد ایک مسلک کی فتح اور دوسرے مسلک کی تغلیط ہو۔

۲۔ مسلک و مشرب کو دین نہ سمجھا جائے اور نہ مسلکی اختلافات کو حق و باطل کی جنگ قرار دیا جائے۔

۳۔ بین المسالک اختلافات کی وجہ سے کسی مسلک کی تکفیر نہ کی جائے اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھانا جائز قرار دیا جائے۔ نیز تکفیر کرنے والی اور دل آزاری کا سبب بننے والی تحریریں کتابوں سے نکال دی جائیں۔

۴۔ علماء کرام اور مسالک کے درمیان اختلافات کو علمی سطح تک محدود رکھا جائے اور اسے عوام کی سطح تک نہ لے جایا جائے۔

۵۔ دینی حلقے اور عامۃ الناس، واعظین اور ذاکرین کی بجائے ان ثقہ و سنجیدہ علماء کرام کو اہمیت دیں جو رسوخ فی العلم اور تقویٰ رکھتے ہوں اور رائے کے اظہار میں ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوں۔

۶۔ چونکہ مسالک میں مشترکات کی کثرت ہے اور اختلافات کم اور معمولی ہیں اور عموماً فروعی، اجتہادی اور ترجیحی نوعیت کے ہیں اس لیے مشترکات کی اساس پر ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیے اور اختلافات کو برداشت کرنے اور ان سے صَرفِ نظر کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

مساجد

۷۔ جمعہ و عیدین کے خطبات اور دیگر دروس وغیرہ میں فرقہ وارانہ موضوعات نہ چھیڑے جائیں اور بین المسالک اختلافات کو ہوا نہ دی جائے بلکہ خطبات اصلاحی نوعیت کے ہوں۔

۸۔ مساجد کو بلاتخصیص عامۃ الناس کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کیا جائے خصوصاً طلبہ اور نوجوانوں کو مسجد سے جوڑا جائے اور علاقہ کے مستحقین (یتیم،مسکین، بیوہ، معذورافراد وغیرہ) کی بلاتفریق مالی مدد کے لیے کمیٹیاں بنائی جائیں۔

۹۔ اگر کوئی مسجد کسی مسلک کی تحویل میں ہو تو کسی دوسرے مسلک والے کو اس پر قبضہ کی کوشش کرنے اور فرقہ واریت وفساد بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

دینی مدارس

۱۰۔ دینی مدارس اصلاً ''دین'' کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے ہیں نہ کہ کسی مسلک کی تعلیم وتغلیب کے لیے لہٰذا مدارس کو فرقہ واریت کی نرسریاں بنانے کی بجائے دینی تعلیم کے مراکز بنایا جائے،مشترکات کو ابھارا جائے، اختلافات کو سمیٹا جائے اور مسالک کے درمیان تقارب اور رواداری کو شامل نصاب کیا جائے۔

۱۱۔ دوران تدریس علماء کرام،اساتذہ اور شیوخ یہ رویہ ترک کر دیں کہ انھوں نے اپنے مسلک کو واحد حق ثابت کرنا اور دوسرے مسالک کو باطل قرار دیتے ہوئے ان کی تغلیط اور نفی کرنا ہے۔

۱۲۔ اس خودساختہ پابندی کو ختم کر دیا جائے کہ ہر مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کا مسلک لازماً ایک ہی ہو۔

۱۳۔ دینی مدارس کو صرف متخصص علماء تیار کرنے کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ عوام خصوصاً جدید سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے (روزانہ بعد عصر اور گرمیوں کی چھٹیوں میں)استعمال کیا جائے۔

۱۴۔ دینی تعلیم کے نصاب پر اس طرح نظر ثانی کی جائے کہ طلبہ فراغت کے بعد عصر حاضر کے مسائل اسلامی تناظر میں حل کرنے کے قابل ہوسکیں اور مغربی فکر وتہذیب خصوصاً جدید معاشی ،سیاسی ،قانونی اور تعلیمی مسائل سے واقفیت اور انگریزی زبان میں مہارت رکھتے ہوں۔

فرقہ وارانہ سرگرمیوں کی بجائے دعوت واصلاح کی تعمیری مصروفیت

۱۵۔ معاشرے میں بڑھتے ہوئے اخلاقی بگاڑ،فساد اور بے دینی کی وجہ سے،جس کا بنیادی سبب دین سے دوری اور مغرب پرستی ہے،علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ اپنے موجودہ کاموں کے علاوہ دعوت واصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کام کو بنیادی اہمیت دیں اور اس پر اپنی توانائیاں صرف کریں خصوصاً جدید تعلیم اور میڈیا کی اصلاح پر توجہ دیں۔

۱۶۔ ایک اہم شعبہ جو علماء کرام کی توجہ کا محتاج ہے وہ خدمت خلق کا ہے تاکہ مسلمان عامۃ الناس کے دکھ درد کم ہوسکیں اور علماء کرام کی سیادت وقیادت پر ان کا اعتقاد مزید پختہ ہو اور ان کا یہ وقار اور مقام نصرت

دین میں ممد و معاون ثابت ہو۔

دینی سیاسی جماعتیں

۱۷۔ دینی سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنانے کی بجائے پاکستان میں نفاذ شریعت کے ایک متفقہ پروگرام پر جمع ہو کر ایک مضبوط سیاسی جماعت/تحریک/محاذ بن جائیں تاکہ ان کا وزن اور اہمیت بھی ہو اور عوام بھی ان کا ساتھ دیں۔

۱۸۔ انتخابات میں نشستیں جیتنے کے لیے دینی سیاسی جماعتوں کی آپس میں کشمکش اور محاذ آرائی ناپسندیدہ ہے اور اس سے بچنا چاہیے۔

اس علامیے پر جن علماء کرام نے دستخط کیے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

- مولانا مفتی محمد خان قادری (مہتمم جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن لاہور)
- مولانا عبدالرؤف فاروقی (جمعیت علماء اسلام [س])
- مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی (جامعہ اہلحدیث، لاہور)
- مولانا عبدالمالک (صدر رابطہ المدارس و جامعہ مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ)
- علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر (ناظم ادارہ منہاج الحسین لاہور)
- مولانا مرزا ایوب بیگ (ناظم اطلاعات، تنظیم اسلامی پاکستان)
- مولانا حافظ محمد نعمان حامد (جامعۃ الخیر، لاہور)
- مولانا سید عبدالوحید شاہ (جماعۃ الدعوۃ پاکستان)
- مولانا حافظ عبدالوھاب روپڑی (جماعت اہلحدیث پاکستان)
- مولانا مہدی حسن (جامعہ المنتظر، ماڈل ٹاؤن، لاہور)
- مولانا ایس ایم عبداللہ جان (مدیر اقراء تہذیب الاسلام، لاہور)
- مولانا نصرت علی شھانی (وفاق المدارس الشیعہ، لاہور)
- مولانا محمد توقیر عباس (جامعہ العروۃ الوثقی لاہور)
- مولانا ڈاکٹر محمد امین (صفاء اسلامک سنٹر، لاہور)

اس کے علاوہ ملی مجلس شرعی کے مندرجہ ذیل علماء کرام نے بھی اس کی حمایت کی ہے:

- مولانا زاہد الراشدی (شریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ)
- مولانا حافظ فضل الرحیم (جامعہ اشرفیہ لاہور)

- مولانا خلیل الرحمن قادری (جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن لاہور)
- مولانا احمد علی قصوری (مرکز اہل سنت لاہور)
- مولانا راغب نعیمی (جامعہ نعیمیہ، لاہور)

تبصرۂ کتب ڈاکٹر محمد امین

درس نظامی کی اصلاح اور ترقی

از مولانا محمد بشیر سیالکوٹی

عربی زبان وادب کا قرآن وسنت اور علوم اسلامیہ کی درس وتدریس سے چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ قرآن وسنت اور اسلامی مأخذ کی زبان عربی ہے۔ ہر مسلمان نماز عربی میں پڑھتا ہے اور قرآنی و مسنون دعائیں عربی میں پڑھتا ہے اس لئے ہر مسلمان خواہ وہ عالم ہو یا عامی اور اس کا تعلق خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو، وہ عربی زبان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں عربی کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اس کے باوجود کہ یہ ایک دینی اور آئینی تقاضا ہے بلکہ دینی مدارس میں جہاں عربی پر اصرار کماً تو موجود ہے کہ عربی صرف ونحو اور بلاغہ کے پیریڈ شائد قرآن و حدیث سے بھی زیادہ ہوتے ہیں لیکن کیفاً اس کی حالت بڑی پتلی ہے اور دینی مدارس کے فضلاء میں زیادہ سے زیادہ اتنی صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ قرآن وحدیث اور کلاسیک عربی پڑھ اور سمجھ لیتے ہیں اور بس۔ نہ ان میں عربی انشاء کی صلاحیت ہوتی ہے، نہ بولنے کی اور نہ جدید عربی زبان کے عملی استعمال کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں عربی کی تدریس کا انداز وہی پرانا اور گردانیں رٹنے کا ہے جس سے زبان پر عملاً مہارت حاصل نہیں ہوتی الاّ یہ کہ کوئی اپنی ذاتی حیثیت میں اس میں بہتری لے آئے جو کہ شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔

یہ وہ صورتحال ہے جس کی اصلاح کے لئے مولانا محمد بشیر سیالکوٹی صاحب عرصہ دراز سے مصروف ہیں انہوں نے صرف ونحو کی تسہیل کی عمدہ کوشش کی ہے اور ہر طرح کی اور ہر سطح کی عربی زبان کی عمدہ تدریسی کتب تیار کی ہیں تا کہ طلبہ میں عربی زبان سننے، سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی ساری صلاحیتیں پیدا ہو جائیں۔ انہوں نے نہ صرف علمی کام کیا ہے بلکہ اسلام آباد میں معہد اللغۃ العربیہ قائم کر کے عملاً ایسے نو

جوانوں کی ایک ٹیم تیار کر دی ہے جو ان کے اسلوب پر عمل کرتے ہوئے اسلامی علوم کے ساتھ عربی زبان میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور اعلیٰ علمی مناصب پر کام بھی کر رہے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے درد کو اس کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے اور دینی مدارس کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے ہاں تدریس عربی کے منہج پر نظر ثانی کریں بلکہ اپنے پورے نظام و نصاب کو اس حوالے سے بدلیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمے میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے اپنی اس کتاب میں درس نظامی کی تاریخ یا اس کی ترتیب کے زمانے کے سیاسی، معاشی ومعاشرتی حالات، ضروریات اور تقاضوں پر لکھنے کی بجائے اس درس نظامی پر بحث کی ہے جسے میں نے پاکستان کی متعدد درسگاہوں میں خود پڑھا اور گزشتہ چالیس پچاس سال سے پڑھا رہا ہوں۔ اور صرف ان مسائل کو پیش کیا ہے جس کا براہ راست تعلق علوم اسلامیہ اور عربی زبان کی تعلیم وتدریس سے ہے اور ان کے نصابات اور طریقہ ہائے تدریس کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کیا ہے۔ پھر ان خامیوں کے منفی اثرات اور انہیں دور کرنے کے لئے مثبت اور مفصل تجاویز دی ہیں اور اپنی گفتگو کو صرف آج کے دور میں تعلیم وتربیت کے مباحث اور مسائل تک محدود رکھا ہے۔ نیز صرف مملکت پاکستان اور علاقے کے اسلامی مدارس کے تعلیمی مسائل پر لکھا ہے کیونکہ میرا اصل مقصد ان اداروں کی تعمیر نو اور ترقی کی جامع اور واضح پالیسی کا خاکہ پیش کرنا ہے۔ **ان ارید الاّ الاصلاح ما استطعت و ماتو فیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ أنیب۔**

اسلامی مدارس کا طالب علم، معلم اور منتظم وخادم ہونے کی وجہ سے مَیں اس امر سے بخوبی آ گاہ تھا کہ قدیم درس نظامی اور دور جدید کی تعلیمی وتربیتی ضروریات اور تقاضوں کے درمیان فاصلہ سالوں یا عشروں نہیں بلکہ صدیوں پر محیط ہے اس لئے اسے ترقی دینے کی غرض سے صرف چند مقالات اور کچھ مفید اصولوں کا تذکرہ ناکافی ہوگا، ایسا کرنے سے ان درسگاہوں کے مخلص معلمین و ناظمین اور دیگر ذمہ داروں کی راہنمائی کا حق ادا نہیں ہوگا بلکہ ان عظیم مقاصد کی تکمیل اور ملک وملت کی صحیح راہنمائی کے لئے تمام تعلیمی مضامین کا الگ الگ اور مفصل تجزیہ اور ان میں مجوزہ تبدیلیوں اور اصلاحات کے مکمل خاکے مرتب کرنا ضروری ہے اور پھر ہر مضمون کے مختلف تعلیمی مراحل اور سطحوں کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ بلکہ یہ بھی مفید اور بہت ضروری ہے کہ ان مفید تجاویز اور مشوروں پر عمل کرنے اور ان سے فوری استفادے کی

غرض سے نئی نصابی کتابوں کی اتنی معقول اور ضروری تعداد مہیا کی جائے جن کی مدد سے ان اسلامی مدارس کی تعلیمی اصلاح اور ترقی کا عمل بلا تاخیر شروع کیا جاسکے۔ اس لئے میں نے:

۱۔ اصلاح و ترقی کی مثبت و مفصل تجاویز کے ساتھ ساتھ جا بجا تعلیمی مضامین کے نمونوں کے مفصل اسباق لکھے ہیں۔

۲۔ جبکہ کئی بنیادی اور اہم مضامین مثلاً تعلیم قرآن اور **اللغة العربية** (نثر و نظم)، تعبیر و انشاء، علم صَرف، علم نحو وغیرہ پر ایسی مفصل کتابیں بھی لکھ چکا ہوں جن میں تعلیم و تدریس اور تربیت و مشق کے جدید اصولوں کے مطابق عمل کرنے کا اچھا اور مفصل مواد موجود ہے۔ اسلامی مدارس ان سے راہنمائی اور استفادہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ میں نے اپنے ۵۰ سال کے طویل غور و فکر، تجربات اور تحقیقات کی روشنی میں اسلامی مدارس کو حقیقی ترقی کی راہ پر چڑھانے کی غرض سے ان کے لئے نصاب تعلیم کے ضروری خدوخال کو واضح کرتے ہوئے تمام تعلیمی مراحل کے مضامین کا الگ الگ نقشہ درج کر دیا ہے جس سے ان کے ناظمین اور معلمین اور تعلیم و تربیت کے سرکاری شعبے فوری طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ نیز ہمارے **معهد اللغة العربية** اسلام آباد میں معلمین و معلمات کے تربیتی کورسز بھی مسلسل ہو رہے ہیں۔ ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کو مولانا محمد بشیر صاحب کی تجاویز پر ہمدردی سے غور کرنا چاہیے اور خصوصاً عربی کی تدریس کے حوالے سے اپنے منہج پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ مولانا کی کتاب اپنے موضوع کا سیر حاصل احاطہ کرتی ہے اور پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ 525 صفحات کی یہ کتاب مولانا کے ادارے دار العلم (699 آب پارہ مارکیٹ، اسلام آباد: فون 051-2253733,2875371) نے شائع کی ہے اور اس پر قیمت درج نہیں ہے۔